ضیاء

ترتیب و تالیف: عتیق آسکوہ بلوچ

ضیاء

(شہید ضیاء الرحمٰن عرف دلجان)

ترتیب و تالیف : **عتیق آسکوہ بلوچ**

نام کتاب.................. ضیاء نامہ

مصنف.................ضیاءالرحمٰن عرف دلجان

ترتیب وتالیف..................عتیق آسکوہ بلوچ

سال...........فروری 2021

انتساب

جہد آجوئی کے فرزندوں کے نام جو آزاد وطن یا مرگِ شہادت کے فلسفے پر عمل پیرا ہیں۔

ترتیب

پیش لفظ

"ہمارے پاس ایسی کہانیاں ہیں، جو حقیقت میں وجود رکھتی ہیں، لیکن اب اس سطح کے لوگ چاہئیں جو اس درد کو بیان کر سکیں۔ وہ ظلم، وہ درد تو موجود ہے لیکن شاید ہمارے پاس قلم نہیں ہے۔ ہمارے گھروں میں تو کئی بھگت سنگھ موجود ہیں لیکن نامعلوم ہیں کیونکہ ہمارے اپنوں نے کھوجنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر کوئی دانا و اعلیٰ پائے کا فنکار ہم میں جنم لے تو اسے کہانیاں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، یہاں تو کہانیاں ہمارے پاس چل کر آتی ہیں لیکن وہ قلم جو میر انیس کے پاس تھا، جو قلم منٹو کے پاس تھا، وہ قلم جو انتظار حسین کے پاس تھا، وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔" یہ الفاظ پروفیسر منظور بلوچ کے ہیں جو انہوں نے 2019 کو دی بلوچستان پوسٹ کو ایک انٹرویو دیتے وقت ادا کیئے تھے۔

بالکل بلوچستان ایک زرخیز زمین ہے، یہاں آپ کو ہر گھر، ہر گلی کوچے، صحراؤں، پہاڑوں اور میدانوں میں روز ایک نئی کہانی ملے گی۔ درد سے بلبلاتی کہانیاں، آہ و بکا کرتی کہانیاں، منتظر کہانیاں، بہادری، دلیری بیان کرتی کہانیاں، شجاعت کی کہانیاں، عشق کی معراج کی کہانیاں اور خود کو قربان کر کے فناء کی کہانیاں، لیکن ضرورت انہیں بیان کرنے کی ہے، ضرورت ان کہانیوں کو الفاظ کے سینوں میں اتار کر قرطاس پر بکھیرنے کی ہے، ضرورت اس ہاتھ کی ہے، جس میں یہ سکت ہو کہ ان کہانیوں کو قلمبند کر کے فرد سے فرد تک، شہر سے شہر تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرے۔

دلجان بھی ان ہی کہانیوں میں سے ایک کا مرکزی کردار ہے، جو شاید اب تک مکمل بیان نہیں ہوسکا ہے۔ کتاب "ضیاء" آپ کے سامنے ہے، اس کو مرتب کرنے کا مقصد ان بکھرے تحاریر کو مجتمع کر کے ان لوگوں تک پہنچانا، جو دلجان اور اس کے ہمسفر ساتھیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

ضیاء عرف دلجان کہانی بننے سے پہلے، کہانی نویس بنا اور بلوچ وطن کے ان جگر گوشوں کی کہانیاں بتاتا اور قلم کے نوک سے صفحوں کے ماتھے پر بہاتا رہا، جنہوں نے حرمت وطن کو عیش کوشی پر معتبر جانا تھا اور ضیاء کے ہمسفر رہے تھے۔ دلجان نے شہید حق نواز، شہید مقبول، شہید عرفان سے لیکر شہید جاوید، شہید مختیار، شہید محترم اور شہید نثار صباء جیسے ہمسفر ساتھیوں کی جدائی پر، ان کے کرداروں پر لکھ کر بلوچ نوجوانوں کو ایک طرح کی سیکھ دی، انہیں درس دیا کہ حقیقی زندگی کیا ہوتی ہے اور غرضِ خود پر نظریہ کیسے سبقت لے جا کر مقدم رہتی ہے۔

اس کے علاوہ ضیاء نے بعض جگہوں پر بے باک انداز میں تضادات کے متعلق لکھا، مختلف موضوعات پر لکھے گئے تحاریر میں وہ ان تضادات کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔

دلجان شور پارود، قلات اور زہری کے حسن کو بیان کرتے ہوئے مہارت سے اسی تحریر میں وطن کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے والے ہیروز کو سامنے لا کر ان کی تعلیمات کو اپنے پڑھنے والوں کیلئے رکھتا ہے۔ وہ ان افراد کو لعن طعن کرتا ہے جو نظریہ کے سامنے آرام و آسائش کا انتخاب کر کے راہ فرار کیلئے جواز بناتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے ہم دلجان کو پڑھیں، دلجان کے ہمسفروں سے ملیں، ان کو محسوس کریں، وہ چاہتے کیا تھے؟ اس کی کھوج کریں۔

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ جنہوں نے کتاب کو مرتب کرنے، تحاریر کو جمع کرنے، پروف ریڈنگ، ٹائٹل اور ترتیب دینے میں معاونت کی۔ کچھ تحاریر کوششوں کے باوجود نہیں مل سکے، شاید کتاب کے اشاعت کے بعد پڑھنے والوں کی جانب سے اس حوالے مدد مل سکے، اور انہیں اگلی ایڈیشن میں شامل کیا جا سکے۔

محبتیں
عتیق آسکوہ بلوچ

بلوچ لبریشن آرمی بیان

20فروری2018

زہری میں فورسز سے لڑتے ہوئے دوسرباز شہید ہوئے: بی ایل اے

زہری تراسانی میں قابض فورسز سے جھڑپ میں دوساتھی شہیداورفورسز کے متعدداہلکار ہلاک وزخمی ہوئے،
زہری تراسانی میں شہید ہونے والے ساتھی بی ایل اے اور بی ایل ایف سے تعلق رکھتے تھے۔

بلوچ لبریشن آرمی کے ترجمان جیئند بلوچ نے نامعلوم مقام سے سیٹلائیٹ فون کے زریعے میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ روز زہری کے علاقے تراسانی میں قابض پاکستانی فوج سے جھڑپ میں شہید ہونے والا ساتھی ضیاءالرحمٰن المعروف دلجان ٹک تیر کا تعلق بی ایل اے سے اور نورالحق المعروف بارگ کا تعلق بی ایل ایف سے تھا، ان ساتھیوں نے جھالاوان میں مشترکہ طور پر مخصوص ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے کل شام قابض فورسز کے حملے کو ناکام بناتے ہوئے جام شہادت نوش کیا، بڑی تعداد میں پاکستانی فوج کے اہلکاروں نے علاقے کو گھیرے میں لیکر مقامی بلوچوں پر حملہ کیا دو سے تین گھنٹے تک جاری رہنے والے جھڑپ میں شہید دلجان اور شہید بارگ نے دشمن کا گھیرا توڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت بہت سے علاقائی لوگوں کو گھیرے سے بحفاظت باہر نکالا اور دشمن فوج کے متعدد اہلکار ہلاک وزخمی کئے اور گولیوں کے ختم ہونے پر دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے پر شہادت کو ترجیح دے کر اپنے زندگیاں اپنے مقصد اور آزاد وطن بلوچستان پر قربان کردیا۔

ترجمان نے مزید کہا ایسے سرباز ساتھیوں کے قومی خدمات اور قربانیوں کو تنظیم کے تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا آزاد وطن کے حصول میں ان قربانیوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا شہید ضیاءالرحمٰن عرف

دلجان (ٹک تیر) پچھلے دس سالوں سے تنظیم سے وابسطہ رہے وہ ان دس سالوں میں حب چوکی، خضدار، قلات شور پارود، کوئٹہ اور بولان میں قومی خدمات انجام دیتے رہے، شہید دلجان اس وقت علاقائی کمانڈر کے حیثیت سے جھالاوان میں سرگرم عمل تھے۔

جیئند بلوچ نے کہا کہ شہید نورالحق عرف بارگ بلوچ 2008 سے بی ایل ایف سے وابسطہ تھے وہ رخشان کے سینئر ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے خاران اور نوشکی میں ایریا کمانڈر کے طور پر طویل عرصے سے خدمات انجام دیتے رہے اور اس وقت جھالاوان میں مخصوص ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اپنے مقصد پر قربان ہوئیں۔

میں دھرتی کا ہوں - شعبان بلوچ

نہ میں میں ہوں نہ مجھ میں میں ہیں
میں فضاء ہوں میں دھرتی کا ہوں

یہ زندگی یہ جو چند سانسیں ہیں
میری نہیں میرے دھرتی کے ہیں
قدم جو اٹھیں منزل کی طرف
یہ احسان نہیں فرض کے لیے ہیں

نہ میں میں ہوں، نہ مجھ میں میں ہیں
میں صدا ہوں میں دھرتی کا ہوں
قدموں کو سکت بخشی ہے ہماری
دشت جبل ساتھ چلتے کاندھوں نے
رشتہ جو خون کے تھے خون ان کا ہوا
میں کسی کا نہیں میں دھرتی کا ہوں

نہ میں میں ہوں، نہ مجھ میں میں ہیں
میں فنا ہوں میں دھرتی کا ہوں

☆☆☆

ایک خط ماں کے نام

میری ماں کے نام جسے میں رشتوں میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہوں جس نے مجھے جنا اور اس دنیا میں لائی۔ آج اُسی کی بدولت میں ان کمزور قدموں کا مالک اس تحریک میں اُن لوگوں کے ساتھ شامل ہوں جنہوں نے کم ہی عرصے میں اپنے دشمن کو حیران اور پریشان کیے ہوئے ہیں جو اپنے ذاتی غرض کو خاطر میں نہیں لاتے، وہ تو قومی سوچ رکھتے ہیں اور عظیم لوگ ہیں۔

ماں، آج میں تمہارے قریب تو نہیں ہوں لیکن اُس ماں کی خدمت میں ہوں جو میرا، آپ کی اور آپ کے بھی ماں کی ماں ہے، سرزمین کا قرض ہم سب پر ہے بس دعا کرنا ماں کہ کبھی دشمن کو پیٹ نہ دکھاؤں۔

فقط آپ کا بیٹا ضیاء الرحمان بلوچ

افسانہ

ضیاءدلجان بلوچ

10 جنوری 2016

جیسے ہی اس نے اپنی ماں کو دیکھا احتراماً اس کی قدموں میں جھک گیا، بہت عرصے کے بعد وہ اپنی ماں سے مل رہا تھا ماں بڑے عرصے کے بعد اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی بیٹے کو باہوں میں لیکر اس کی آنکھیں دجلہ وفرات کا منظر پیش کرنے لگی، وہ بھی اپنے آنسوؤں کو قابو نہیں کر پا رہا تھا، بیٹے کو دیکھ کر کئی سالوں سے خشک آنکھوں سے آنسو خود بخود جاری ہو گئے ماں بیٹے کو پھر گلے سے لگاتی اور اس کی خوشبو کو سونگتی، ماں بیٹے میں دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا، بڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا کہ بیٹے سے ملنے کے لئے اس کا باپ بھی انتظار میں کھڑا ہے، باپ بیٹے سے ملا تینوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

ماں نے دیکھا بیٹا بہت کمزور ہو گیا ہے داڑھی بھی کافی نکل آئی ہے۔اب میرا بیٹا بڑا ہو گیا ہے اس کے کندھوں کی طرف دیکھا جو بندوق کی میگزینوں کے وزن سے کافی کمزور لگ رہے تھے،اس کے کپڑے کئی جگہوں سے پھٹے ہوئے تھے،اس کے جوتے بہت پرانے ہو چکے تھے جو کبھی پالش نہیں ہوئے ہوں، بال کافی لمبے ہو گئے تھے۔ماں کو اس کے اسکول کا دور یاد آیا جب کبھی بال تھوڑے بڑے ہوتے تو وہ اس سے ضد کر کے پیسے لیتا کہ اسکول میں ٹیچر سے بال بڑے ہونے پر مار نہ پڑے، وہ بغیر استری کے کپڑے نہیں پہنتا تھا،اب اس کے جسم پر جو کپڑے تھے ان کا رنگ کئی جگہوں سے مٹ چکا تھا۔

کم وبیش باپ بھی بیٹے کی ان چیزوں پر سوچ رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ماں نے پوچھا بیٹا کیسے ہو، تمہارے سب سنگت کیسے ہیں، سب ٹھیک ہیں نا؟ بیٹا، کیا وہ آپریشن بہت بڑی نوعیت کی تھی جس میں امیر جان، شیر جان اور گزین جان شہید ہو گئے؟ میں نے سنا تھا کہ دشمن کی بھاری فوج کے ساتھ سترہ ہیلی کاپٹروں نے بھی آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ سات اپریل 2014 کو تمہارے چھوٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ سرکاری ٹی وی پر اپنے آپریشن جاری ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ میں نے جیسے ہی آپریشن کا سنا جائے نماز اٹھا کر تمہاری اور تمہارے سرمچار دوستوں کی کامیابی کے لئے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔ تم سب کی خیر و عافیت کے لیے خدا کے آگے ہاتھ اٹھا کر گڑ گڑایا، شام کو جب سرکار نے اعلان کیا کہ آپریشن مکمل ہو گیا ہے اور چالیس سرمچار مارنے کا دعویٰ کیا تو میرا دل بیٹھنے لگی۔ ساری رات جاگتے گزری، ہر پل یہی خیال دل میں آتا کہ چالیس شہید ہوئے تو پھر بچا کون لیکن اپنے آپ کو تسلی دیتی رہی کہ سرکار جھوٹ کہہ رہا ہے، رات کو کھانے پر بیٹھی تو ایک بھی نوالہ حلق سے نہیں گزرا، صبح جب تمہارے بھائی نے بی ایل اے کا بیان پڑھ کر سنایا کہ میرک بلوچ نے کہا ہے کہ ہمارے تین ساتھی شہید ہوئے ہیں۔ دل کو تھوڑی تسلی ہوئی باقی دو کے نام سن کر دل رونے لگا لیکن امیر الملک کا نام آتے ہی کلیجہ منہ کو آیا، امیر کا نام بہت عرصے سے سنا تھا کہ دشمن نے کیسے اس کے گاؤں پر دھاوا بولا تھا کیسے اس کے بھائی اور رشتہ داروں کو اغواء کیا جن کا آج تک کچھ پتہ بھی نہیں چل رہا کہ وہ زندہ ہیں یا مار دیے گئے۔ بس بیٹا آپ اور آپ کے سنگت قربانی دے رہے ہیں اور کچھ اپنی ان قربانیوں کا سودا کر رہے ہیں، بیٹا یہ آج کل کیا ہو رہا ہے حاجی قلاتی کے بعد روزانہ خبریں آرہی ہیں کہ بہت سے سرمچاروں نے ہتھیار سرکار کے حوالے کیے ہیں، شروع میں میں یہی سمجھتی رہی کہ سرکار جھوٹ بول رہا ہے لیکن جب تمہارے دوست آغا اور ثناء کا نام سنا کہ انہوں نے بھی سرکار سے معافی مانگی ہے تو سرکار کی کچھ کچھ باتوں پر یقین ہونے لگا۔ یہ سب کیا ہے میں زیادہ نہیں جانتی تم زرا بتاؤ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ماں بولے جارہی تھی بیٹا ماں کے پوچھنے پر کہنے لگا کہ حالات سخت سے سخت ہورہے ہیں اس لیے کچھ لوگ واپس چلے گئے، کچھ اپنی تنظیم کی کمزوریوں کو دیکھ کر کمزور پڑ گئے کچھ اپنے ہمسفر دوستوں کے رویے دیکھ کر مایوس ہو گئے، بس اماں کچھ سرکار کی ستم اور کچھ اپنے کمانڈروں کی مہربانی ہے۔ اماں حقیقت جانو تو کمزوری ہمارے بندوں میں بھی ہے۔

ماں بیٹے کی باتیں سنتی جارہی تھی، اسے اپنے بیٹے کی باتوں سے تھکاوٹ اور مایوسی محسوس ہورہی تھی جب اس نے اپنے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے میں اسے آغا، ثنا اور قلاتی کے چہرے نظر آنے لگے، اس کی موجودگی سے بوجھ محسوس ہونے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جس بیٹے کو اپنے سینے سے جدا کرنا نہیں چاہتی اب اس کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر اسے اپنے جگر کے ٹکڑے کی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، گلوگیر آواز میں بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی بیٹا میں تمہاری ماں ہوں، نو مہینے تمہیں اپنی کوکھ میں رکھا ہے، کئی سال تک تمہیں پالا پوسا، میں اچھی طرح جانتی ہوں بیٹا تم اپنی کمزوری اور نالائقی کو کیوں کسی اور کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہو۔ بیٹا صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم تھک گئے ہو، دشمن کی طاقت کو دیکھ کر کیوں ڈرنے لگے ہو، کیوں اس بات کا اقرار نہیں کرتے کہ مرنے سے زیادہ تمہیں زندگی عزیز ہے۔

بیٹا کہنے لگا نہیں اماں آپ سادہ ہو۔ آپ کچھ نہیں جانتے، یہ سب اپنی کمانڈری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں ان کی کمانڈری کے لیے آپ سب کو خوار اور دربدر نہیں کرسکتا۔

ماں نے کہا ہاں بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن دشمن کے ظلم دیکھ کر،

ہر روز گرتے بلوچ نو جوانوں کی لاشوں اور تمہاری دوری نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ بیٹا مجھے جتنا خواری، جتنی در بدری دیکھنی تھی دیکھ لی۔ تمہارے پہاڑوں پر جانے کے بعد میں نے تمہارے رشتہ داروں کی کیسی کیسی باتیں سنیں، انہوں نے ہمارے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں پتہ نہیں تمہارے اس کزن کا جو پاکستان کی فوج میں تھا اسکی شادی پر تمہارے چچا نے ہمیں بلایا بھی نہیں بلکہ چھپ چھپا کر شادی کر دی۔ بیٹا ہم تمہاری جدوجہد کے سامنے کبھی رکاوٹ نہیں بنے جب ہمیں کچھ پتہ چلا اس جنگ کے بارے میں تو ہم ہمیشہ تم سب کی کامیابی کے لئے دعا کرتے رہے ہیں آج جب میں اس جدوجہد کو سمجھنے لگی ہوں تو پھر تمہیں کیا ہوا تم تو خود مجھے دشمن کے بارے میں بتاتے رہے اور ایک بات آج تم کہتے ہو تنظیم کمزور ہے یا کہتے ہو سینئر دوستوں میں کمزوری ہے یا وہ تم جیسوں کو اپنی کمانڈری کے لیے استعمال کر رہے ہیں تو بیٹا مجھے معلوم ہے تم اور تمہارے دوست استعمال ہو رہے ہیں لیکن کسی ذات کے لیے نہیں بلکہ بلوچ سر زمین کے لیے استعمال ہو رہے ہیں اور ماں کے درد کو وہ بیٹے سمجھ سکتے ہیں جو اپنی ماں سے محبت کرتے ہیں۔

باپ جو خاموش بیٹھا اپنے بیٹے اور اس کی ماں کی باتیں سن رہا تھا اپنی بیوی سے کہنے لگا نیک بخت بیٹا آرام کی زندگی گزارنا چاہتا ہے اور تم اسے واپس بھیجنا چاہتی ہو شاید وہ یہاں رہ کر کچھ کمائے گا تو ہمارے بڑھاپے کے دن آرام سے گزر جائیں گے۔

بیوی اپنے شوہر سے کہنے لگی کہ اگر تمہارا بیٹا گھر میں بیٹھنا چاہتا ہے تو جا کر ان لاپتہ نو جوانوں کو لے کر آئے جن کی مائیں اس امید کے ساتھ جی رہے ہیں کہ اس کے بیٹے کے دوست دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ جاؤ جا کر امیر جان کو لے کر آؤ اسکی ماں نے اسے کئی سالوں سے نہیں دیکھا تھا، شیر جان کو لیکر آؤ جس کے معصوم بچے اس کے

انتظار میں ہر روز گھر کا دروازہ تکتے رہتے ہیں، میرے نثار جان کولیکر آؤ جس کا آخری دیدار اس کی ماں کو نصیب نہیں ہوئی، حق نواز کو یاد کرو جس کی لاش کو تم نے اپنے ہاتھوں سے گاڑی میں ڈال کر اس کی ماں کے پاس روانہ کیا تھا۔ جاؤ جا کر ان سب کی ماؤں کو جواب دو پھر آ کر میرے پہلو میں چھپ جاؤ۔

اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کی باتیں سننے کے بعد کافی شرمندہ تھا کہ اسی اثنا اس کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا ادھر اُدھر دیکھنے لگا وہ اپنے جُھگ نما کمرے میں تھا وہ اپنا جاٹہ اور بندوق اٹھا کر اوتاک کی طرف روانہ ہوا اور اپنی کمزوریوں پر سوچتا ہوا دوستوں کے پاس پہنچ گیا۔

☆☆☆

آٹھ سال

ضیاء دلجان بلوچ

12 دسمبر 2016

آٹھ سال پہلے ایک شخص ڈھونڈ تے ڈھونڈ تے میرے پاس آیا اور میرے ساتھ دونسل پرانی رشتہ داری جوڑ دی۔

آٹھ سال بعد جب اس کا نمبر ڈھونڈ تے ڈھونڈ تے میں نے اس کے ساتھ بات کی تو نام سن کے فون بند کر دیا۔ میں آٹھ سال پہلے کے مہر محبت اور آٹھ سال کے بعد کی نفرت پر پریشان نہیں ہوا بلکہ پوری کہانی سمجھ گیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

صنوبر کی یادیں

ضیاء دلجان بلوچ
24 مئی 2016

یہ مئی کا مہینہ ہے پھر بھی ملغوے میں موسم سرد رہتا ہے۔سال کے اکثر دنوں میں تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں آج بھی ملغوے میں ہوائیں تیز تھیں صنوبر کے درخت تیز ہواؤں کی وجہ سے جھول رہے تھے ملغوے دشت میں بہت سے صنوبر کے درخت موجود ہیں ان کے بیچ میں۔۔۔میں سب سے بوڑھی صنوبر کہیں دنوں کی تیز ہواؤں سے میری جڑیں عمر کے ساتھ کمزور پڑھ گئی ہیں آج کچھ دنوں سے میں کافی پریشان تھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب میرا آخری وقت آپہنچا ہے میرے تنے اور جڑوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ تیز ہواؤں کا مقابلہ کرسکیں اور دوپہر کو جو تیز ہوا چلی تو مجھے چند لمحوں کے لیے لگا کہ بس اب ختم ہونے والی ہوں جب ہوائیں رک گئیں تو بہت دیر تک مجھے سانس لینے میں مشکل پیش آئی وہ تو بھلا ہو نزدیک موجود دوسرے صنوبر کا جس نے مجھے سہارا دیا تھوڑی دیر بعد جب میرے اوسان بحال ہوئے شام تک پریشانی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کیا کہ اس دنیا میں جو بھی آتے ہیں انہیں جانا ہوتا ہے اور اب میرے جانے کا وقت بھی قریب آیا ہے لیکن دل میں ایک ارمان کہ وہ دن نہیں دیکھ پاؤں گی جس دن کی خاطر میرے زمین کے سپوتوں نے مشکلات وخواری برداشت کی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد آتے ہیں جب بابو نوروز، بھاول، خان بٹے خان میرے سائے تلے بیٹھ کر اپنی جنگی حکمت عملیاں ترتیب دیتے۔کیسے بھاول خان زمین پر جنگی پلان کا نقشہ کھینچ کر اپنے دوستوں کو سمجھاتے تھے۔ میں جب بابو نوروز کی طرف دیکھتی تو بابو 80 سال کا ہونے کے باوجود باہمت نظر آتا، بھاول، بھٹے، مستی کے

نوجوانی اور گرم خون کو دیکھتی تو فخر سے ان کی طرف دیکھتی ہی رہ جاتی اور جب دوپہر کے وقت یہ سب لوگ میرے سائے میں ستانے لیٹ جاتے تو میں اپنی شاخوں کو پھیلاتی کہ کہیں سورج کی شعاعیں ان کی نیند میں خلل نہ ڈالے۔ میں ان سب کی باتیں سن چکی تھی کہ جس کی جتنی ہمت ہو وہ اپنی بساط کے مطابق قومی تحریک میں اپنا حصہ ڈالے اور میری بھی اتنی بساط تھی کہ ان کو سایہ بخش سکوں۔

پھر 15 جولائی کا وہ دن بھی آیا جب دشمن نے ان سب کو شہید کیا اس دن میں بہت روئی میرے آنسوں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وطن میں طویل خاموشی ہر بزگر شوان اپنے خواریوں میں غرق اپنے گدان تک محدود رہا مگر مجھ جیسے صنوبر کا انتظار کہ ختم ہی نہ ہوا، کیوں ہوتا مجھے تو وطن کے سپوتوں کے آنے کا یقین تھا تب ہی تو اس انتظار میں مَیں اور تن آور ہو کر اپنی مٹی کے سپوتوں کو اور سایہ دار بن کے دکھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ کبھی کبھار قلات کی طرف سے چلنے والی گورتیچ کے جھروکوں میں اپنے شہیدوں کی خوشبو آتی محسوس کی۔

اسی انتظار میں وقت گزرتے گزرتے 73 کا زمانہ آیا چند لوگوں کو دور سے آتے دیکھا لیکن میں انہیں پہچان نہیں پا رہی تھی سب کے کندھوں پر بندوقیں تھیں وہ میری طرف آرہے تھے جب وہ میرے قریب پہنچ گئے تب بھی نہیں پہچان سکی تھوڑا اور نزدیک آئے تو ان میں موجود کا کا علی محمد کو پہچان لیا پھر کا کا علی محمد کی آواز میری کانوں میں پڑی، اس نے آگے والے شخص سے مخاطب ہو کر کہا سفر جان بابو نوروز اکثر اس درخت کے سائے میں بیٹھتا تھا وہ سب آکر میرے سائے میں بیٹھ گئے، میں سمجھی شاید ہوگا کوئی میر معتبر جو شکار کرنے یا مالداروں سے بجار لینے آیا ہوگا لیکن میرے تمام اندیشے غلط ثابت ہوئے جب ان کی باتیں میری کانوں میں پڑی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا یہ سب بندوقیں اٹھا کر بابو نوروز کے نقش قدم پر چل کر بلوچستان کی آزادی کی جنگ لڑنے نکلیں تھے ان کی باتیں سن کر ان کی تعداد دیکر میں بہت خوش ہوئی میری جڑوں اور شاخوں میں نئی جان آئی خوشی سے میرے آنسوں نکلے مجھے بھٹے خان کی وہ بات یاد آئی جو اپنے ایک نوجوان دوست سے ایک دن کہہ رہا تھا کہ ہم ہوں نہ ہوں اب یہ جنگ نہیں رکنے والی، آج جب میں نے سفر خان اور اس کے ساتھیوں کو

دیکھا تو سمجھ گئی کہ بھٹے خان نے جو کہا درست ہی کہا۔

میری یہ خوشیاں بھی چند مہینوں کے رہے پھر کسی آستین کے سانپ نے سفر خان کی مخبری کر کے دشمن کو اس کے ٹھکانے تک پہنچایا، سفر خان بہادری سے لڑتے لڑتے شہید ہوا ایک مرتبہ پھر پورا بلوچستان آہ و زار رونے لگا ایک مرتبہ پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی، ایک دفعہ پھر میرے آس پاس ریزہ و مژ مونک کے بُوچ اداسی سے نڈھال ہو گئے۔ اس درمیان کئی سال گزرے پھر کبھی کسی وطن کا جان نثار میرے قریب سے نہیں گزرا۔ ہر صبح اس انتظار میں شام ہوتی کہ کوئی سرمچار بندوق لیکر آئے پھر سے میرے سائے میں آ کر بیٹھ جائے، میں اس یقین پر تھی کوئی تو آئے گا کیونکہ ابھی تک وہ ستاروں بھری صبح، وہ خوشیوں کا دور، وہ منزل نہیں آئی۔ میں راتوں کو جاگ جاگ کر گزارتی کہ وطن کا کوئی سپاہی رات کو آ کر میرے تنے پر ٹیک لگا کر آرام کریگا لیکن میری انتظار بس انتظار ہی، میں دور سے کبھی کبھی کا کا علی محمد کو دیکھتا جو اب بوڑھا ہو چکا ہے، کبھی کبھار اپنے بکریوں کو چراتے چراتے میرے قریب سے گزرتا میں جب بھی کا کا علی محمد کی طرف دیکھتی تو ایسا لگتا کہ وہ بھی ضعیف آنکھوں میں میری طرح کسی سرمچار کو دیکھنے کی آرزو لیے اب کمزور ہو چکا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو خود کے درد کی داستانیں سنانا چاہتے تھے مگر کبھی ہمت نہیں ہوئی۔

پھر 2004 کا وہ سال بڑی مدتوں وانتظار کے بعد آیا اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ تنے ٹوٹنے لگے تھے جڑوں میں کمزوری پڑ گئی تھی مگر اب کا کا علی محمد کے چہرے پر اطمینان کا سماں تھا اس کے بوڑھے کاندھے پھر سے تندرست لگنے لگے تھے، اس کی آنکھوں میں ہمت و حوصلہ دیکھ کر مجھے امید نظر آنے لگی مگر مجھ تک کبھی کوئی خبر نہ پہنچی پھر چند سال بعد چند نوجوان آئے بے حد تھکے ہوئے شاید بڑی مسافت طے کر کے آئے تھے، آ کر یہیں میرے سائے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اب مجھے ایسے منچلے نوجوانوں کی باتوں کی عادت ہو گئی تھی۔ میں ان کو اب کبھی نہیں سنتی تھی یہاں اکثر پکنک و شکار کی غرض سے آ کر خوبصورت پرندوں و جانوروں کو موت کے گھاٹ اتارتے تھے اور ہر بار ہر کوئی خلیجی ممالک جانے کا آرزو رکھتا میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے کہ جس ٹہنی کے سائے میں بابو، بھٹے، سفر خان بیٹھ کر لمہ وطن کی آجوئی کی خاطر مشکلیں کاٹ رہے تھے وہیں بیٹھ کر یہ نوجوان

اپنے محبوبہ کی زلفوں کی تعریف کرتے ہیں۔
آج میں ان آنے والوں کے باتوں کو بھی نظرانداز کردیتی کہ ان میں سے کسی نے کہااس سرزمین پر راج کرنے والے سرداروں کو بھی لمہ وطن کے ساتھ غداری کا حساب دینا ہوگا، بس یہ سننا تھا کہ میں نے پلٹ کراس کی طرف دیکھا ایک خوبصورت نوجوان برزقد مضبوط جسامت چھوٹی پیشانی سخت بال پیچھے کو مڑے ہوئے ملغوے کی چوٹی پر مجھ سے تھوڑی دوری پر کھڑا اپنے باقی دوستوں سے کہہ رہا تھا۔ یہ نوجوان اُن اوباش نوجوانوں میں سے نہیں ہیں، یہ تو وطن کے جانثار ہیں یہ جن کے کاندھوں پر بندوق لٹک رہے ہیں یہ کسی خوبصورت جانورو پرندوں کے شکار پر نہیں نکلیں یہ سلاہ بند اس خون خوار ہُوک کے تعاقب میں نکلے ہوئے ہیں جس نے ہماری سرزمین کو بنجر بنادیا ہے۔

میں جھک کر ان الفاظوں کو ادا کرنے والے نوجوان کے پیروں کو چھونا چاہتی تھی کہ جس نے میری آنکھوں میں بسے صدیوں کے انتظار کو ختم کردیا۔ میں اس کے ماتھے کو چومنا چاہتی تھی کہ جس پر وطن کی خاطر مشکلات وخواری صاف ظاہر آرہی تھی، اُونچائی سے اتر کر جب یہ اپنے باقی دوستوں کے ساتھ میرے قریب پہنچا تو میں اسے جان گئی یہ میرے ہی دشت کا حئیَ (نثار) ہے جو آج بابو نوروز، بھٹے وسفر کے کارواں کو آگے بڑھانے کو دشت دشت پھر رہا ہے۔ یہ وطن کی خاطر ان دشوار گزار راستوں پر نکل پڑے ہیں تھکن سے چور مگر امید، حوصلہ، بہادری ان کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ وہ تمام دوست بے حد تھکے ہوئے تھے رات وہ جلد نیند میں چلے گئے۔ میں سمجھ نہیں سکی کہ آج رات بھر کس لیے روتی رہی۔ کیا وہ غم کے آنسو تھے کہ آج بھی میرے نوجوان اس قدر خواری برداشت کر رہے ہیں یا خوشی کے آنسو کہ آج بھی وہ کارواں رواں دواں ہے اپنے آجوئی کی منزل کو یا شاید اس لیے کہ میرے برسوں کی انتظار ختم ہوگئی۔ میں کا کا علی محمد کو تلاش کرنے لگی میں زور زور سے ہنسنا چاہتی تھی، میں چیخ چیخ کر کا کا علی محمد کو بتانا چاہتی تھی کہ آکے دیکھ یہی ہیں نا وہ لوگ جن کی وجہ سے آپ کے ماتھے پر اطمینان تھی، دیکھ آج پھر میں نے پالیا ان خوشیوں کو، دیکھ آج میرے بھی کاندھے تمارے بوڑے کاندھوں کی طرح اکڑ کر جوان ہو گئے، آکر دیکھو آج اسی راستے وطن کا سرمچار حئیَ آیا ہوا ہے، دیکھنا ہیں تو

آ جاؤ اور ان کا حوصلہ اور کاروان دیکھ لو۔

اس رات جب میرے پاس کوئی نہیں تھا تو میں نے اپنے قریب کے دونو جوان صنوبروں کو اپنی خوشی کی وجہ بتائی اور انہیں بتایا کہ کس قدر نسل در نسل یہ وطن کے سپوت اس کی خاطر قربان ہونے نکل پڑتے ہیں یہ صدیوں کی داستان ہے جو میرے وطن کے بیٹوں نے اپنے خون سے لکھی ہے۔
صبح ہوتے ہی حئی اور اس کے دوست آگے جانے کی تیاریوں میں لگ گئے، میں جانتی تھی کہ ان کی منزل یہ نہیں پھر میں چاہتی تھی کہ وہ نہ جائے، میں انہیں روک لوں، انہیں بتا سکوں کہ کتنے برس کی پیاس بجھانی ہیں مجھے۔انہیں بتا سکوں کہ برسوں سے زلفوں کی تعریف سنتی آ رہی ہوں مگر سفر و نوروز کی داستان نہیں بھولی ذرا بیٹھو تو سنا دوں مگر انہیں جانا تھا سو چلے گئے اور میں نے انہیں ملغوے کی آخری چوٹی سے اترتے دیکھا۔یہ ملاقات ان کے ساتھ بھی آخری ملاقات ہی رہی۔درد کی یہ داستاں جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی 8 نومبر 2012 کو سوراب سے آئے نمی نے پھر سے تمام زخموں کو تازہ کر دی جب حئی شہید ہو کر بیر گیر بنا اس کم عمری میں سرخ رو ہو چلا۔

اب میری بھی شاید آخری سانسیں ہیں اب شاید جڑیں ساتھ چھوڑ دیں اور کب زمین بوس ہو چلوں مگر اتنا یقین ہے کہ یہ تین نسلیں جن کو میں نے اپنے سائے میں بیٹھے دیکھا میری مٹی کے اصل حقدار و سپوت یہی ہیں۔یہاں ملغوے سے لیکر بولان مکران تک ہزاروں سفر، نوروز اور حئی جیسے وطن کے جان نثار سر بہ کفن ہونگے۔مجھے امید ہے کہ میرے بعد میرے ساتھ ٹہلنے والے یہ دو صنوبر ملغوے سے چڑتے نوجوانوں سے زلفوں کی بجائے بھٹے خان کی طرح زمین پر لکیر کھینچتے ہوئے اپنے جنگی پلان بنانے والے نوجوانوں کو دیکھیں گے، ان راستوں سے بابو نوروز سفر و حئی پھر بندوق تھامے محو سفر ہونگے تم بس انتظار کرنا وطن کے بیٹے ابھی تھکے نہیں۔

ماضی اور حال کا کامریڈ

ضیاء دلجان بلوچ

7 ستمبر 2017

ستر کی دہائی میں جب بلوچوں نے بغاوت کی تو بلوچستان کے مختلف علاقوں میں جنگ چھڑ گئی, کوہستان مری، وڈھ اور قلات میں مختلف محاذوں پر دشمن پر حملے ہونا شروع ہوگئے۔ کاہان میں شیر ومری تو وڈھ میں علی محمد مینگل ،دشت گوران میں لونگ خان تو زہری کے پہاڑوں میں سفر خان اور قلات مشکے میں اسلم گچکی ، بی ایس او کے چیئر مین خیر جان بلوچ ،عبدالنبی بنگلزئی برسر پیکار تھے۔ دشمن کے خلاف ان بڑے نامی گرامی شخصیات کے ساتھ اور کئی گمنام سپاہی مادر وطن کی آزادی کے لیے جہد و جہد کررہے تھے،ان گمنام ہستیوں میں ایک نام کامریڈ فقیر کا تھا، جو بلوچ قبائل میں ایک کمزور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ کامریڈ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تو تھا لیکن اس غربت میں بھی کامریڈ کے دل میں وطن کیلئے اتنی ہی محبت تھی جتنا دوسرے معتبر ناموں کے دلوں میں تھا بلکہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حقیقی انقلاب اور تبدیلی غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی برپا کرسکتے ہیں۔ کامریڈ بھی دوسرے گوریلوں کی طرح وطن کے عشق میں خاک چھاننے لگا۔ وہ ہر وقت ہر محاذ پر تیار رہتا کبھی بھی وہ کسی سے پیچھے نارہا،اس کی آنکھوں میں اوروں سے زیادہ وطن کے عشق کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ نو جوان تھا، خون گرم تھا، انقلابی سوت سن کر اس کا خون اور گرما جاتا۔ 73 میں گوریلوں کی اکثریت پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن کامریڈ پڑھنا لکھنا اچھی طرح جانتا وہ اکثر بی بی سی کے خبریں سن کر پھر بلوچی میں اپنے باقی دوستوں کو سمجھا تا۔ کامریڈ ہر کام میں پیش پیش تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جو کام کرنا ہے انہیں کرنا ہے، کبھی راشن لانا ہوتا یا کسی دوسرے کیمپ کمانڈ کو پیغام پہنچانا ہوتا وہ ہمہ وقت تیار تھا، کیونکہ اسے آزادی کی قیمت شعوری طور پر معلوم تھی۔ اس کے ہاتھ کبھی کوئی اخبار لگتا یا کوئی کتاب تو وہ اسے پڑھنے بیٹھ

جاتا۔ باقی دنیا کے دیگر ملکوں میں آزادی کی جنگوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ بلوچ گوریلوں کو جب بھی موقع ملتا وہ دشمن پر حملہ کرتے، کامریڈ بھی اکثر حملوں میں ان کے ساتھ ہوتا اور جنون کی حد تک دشمن پر وار کرتا۔ وہ فارغ وقتوں میں اکثر آزادی کے گانے گنگناتا اور خوشی خوشی اپنے حصے کے روزمرہ کام سرانجام دیتا تھا۔
دشمن نے ہر طرح سے زور آزمائی کی لیکن بلوچ گوریلوں کو ختم نہ کر سکا آخر کار دشمن نے اپنی چال بدل لی اور عام معافی کا اعلان کیا بہت سے بڑے کمانڈروں کو پرآسائش زندگیاں بسر کرنے کی پیشکش ہوئی۔ بہت سے نامی گرامی کمانڈر دشمن کی اس چال میں آگئے اور ہتھیار پھینکنا شروع کر دیا، جو بھی کمانڈر سرنڈر کرتا تو اس کے انڈر موجود تمام سپاہی سرنڈر ہوتے کیونکہ اکثریت جنگ میں ان لوگوں کی تھی جن کا کوئی بڑا معتبر اس لڑائی میں ساتھ تھا۔ جب ان کا سرکردہ سرنڈر کرتا تو ان کے لیے بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا اور نہ ہی کسی نے ان کی اتنی سیاسی تربیت کی تھی کہ تمہاری جنگ کسی ایک شخص کی خاطر نہیں بلکہ تمہاری بندوق سے نکلنے والی گولی، وطن کے سینے پر بڑھنے والے تمہارے چار قدم تمہاری قوم، تمہاری سرزمین کے لیے ہیں۔

کامریڈ تو خالصتاً وطن کی آزادی کے لیے چل پڑا تھا۔ وہ کسی شخص کسی میر معتبر کی خاطر نہیں آیا تھا اسے تو وطن کے عشق نے ان پہاڑوں میں رہنے پر مجبور کیا تھا وہ تو آزادی کا خواب لیے دن رات پہاڑوں میں محوِ سفر تھا وہ تو گھر میں ماں سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ واپس گھر آیا تو اس کی لاش آئے گی یا وہ ایک آزاد وطن کے آزادی شہری کے طور پر گھر میں داخل ہوگا۔ اب وہ سوچ رہا تھا ان میں سے تو وہ ایک بھی تو نہ لا سکا وہ دشمن کی ہر گولی سے اپنے آپ کو بچاتا کہ ابھی اسے اور مزید کئی کام کرنے ہیں، ابھی تو اس کے شہید دوستوں کا خون بھی تو خشک نہیں ہوا تھا جن کے ساتھ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ان کی شہادت ضرور رنگ لائے گی۔ ابھی تو ان کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں موجود آزادی کے خواب اسے یاد تھے، ان کے خاموش چہرے پر ابھی آزادی کی امنگ باقی تھی، وہ تو ان سب کی محفلوں کا ساتھی تھا جو ایک ایک کر کے سرزمین پر قربان ہوئے۔ ان سے تو وعدہ بھی کیا تھا کہ آخری سانس تک آزادی کی جنگ لڑینگے، وطن کی چاہ میں جو پہلے مارا گیا تو دوسرا اس کے حصے کی ذمہ داریوں کو پورا کرے گا، ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھی۔ یہ سب وعدے ارادے چھوڑ کر وہ کیسے واپس

جا سکتا تھا لیکن وہ پھر سوچنے لگا سب تو واپس جا رہے ہیں وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے وہ بھی باقیوں کی طرح آنکھیں جھکا کر گھر میں داخل ہوا پھرنا چاہتے ہوئے بھی معاشرے کے ساتھ اسے چلنا پڑا۔
آج کی جنگ میں بھی کئی ایسے کامریڈ موجود ہیں اور کئی 70ء کی دہائی کی طرح نامی گرامی شخصیات بھی اور یہ جنگ باقی جنگوں سے طویل ہے اور مختلف بھی۔ اب تک ہزاروں کامریڈوں نے قربانیاں دی ہیں اور کئی کامریڈز جدوجہد میں شامل ہیں۔

تہتر کی طرح 2015 میں بھی دشمن نے پھر اپنے پرانے سرنڈر کی چال چلی، بہت سے کمزور جہد کار تو واپس چلے گئے لیکن لیڈر شپ اور اہم کمانڈر اپنے کئی کامریڈز کے ساتھ مل کر جنگ کو جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ان جہد کاروں کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سرنڈر کا یہ گاجر ان کے سامنے بھی دشمن خوبصورت بنا کر پیش کریگا اگر خدانا خواستہ لیڈر شپ یا کمانڈرز دشمن کی اس چال میں آگئے تو انہیں یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیے کہ ماضی کے کامریڈ سے موجودہ دور کا کامریڈ بہت الگ ہے۔ آج کا گوریلا ہر لحاظ سے مکمل لیس ہے۔ اگر وہ گھر چلے گئے اور یہ سمجھنے لگے کے جو تھے ہم تھے اب اور کوئی نہیں ہے پہاڑوں میں، تو وہ غلطی پر ہونگے۔ آج کا کامریڈ تحریک کے ان نشیب فراز سے اچھی طرح واقف ہیں اور اتنے سال کی جنگ میں وہ یہ سیکھ چکے ہیں کہ جنگ کو جاری کیسے رکھا جاتا ہے۔ دشمن پر کب، کہاں اور کیسے حملہ کرنا ہے، مالی کمک کیسے حاصل کرنا ہے۔ آج کے معتبر لیڈروں کمانڈروں کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ جنگ اب بڑے ناموں کی خاطر نہیں لڑی جارہی بلکہ آج کی تحریک اس آزادی کے لیے لڑی جارہی ہے جس آزادی کے خواب کو آنکھوں میں سجائے کئی کامریڈ شہید ہو چکے ہیں، کئی کامریڈز دشمن کے ٹارچر سیلوں میں اذیت سہہ رہے ہیں۔ آج لیڈر شپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ بلوچ نوجوان ایک خالص سوچ لیکر گھروں سے نکلے ہیں۔ آج کا نوجوان لائبریریوں سے نکل کر پہاڑوں تک کا سفر کرنے والا نوجوان ہے۔ آج کے نوجوان کامریڈ کو کوئی لیڈر اپنے بکریوں کا ریوڑ نہ سمجھے، آج کے گوریلے کو کوئی روبوٹ مشین نہ سمجھے کہ جب کام لیا تو لیا جب سوئچ آف کر دیا تو کام ختم۔

☆☆☆

بلوچ لیڈر اور میرا یار

ضیاء دلجان بلوچ

1 دسمبر 2017

آج میں بلوچ لیڈروں کے پیروکاروں کی حرکتوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے میرا ایک پرانا دوست یاد آتا ہے۔ بی ایس او کا دور تھا، اتحاد توڑ پھوڑ کے دور میں ہم بھی بی ایس او کے ایک آدھ ممبر شپ کارڈ رکھتے تھے۔ بی ایس او کی تقسیم ہوئی تو کئی لوگ چیئر مین شپ یا مرکزی کابینہ یا سینٹرل کمیٹی کے لیے بہک گئے، وہی پر میں نے اپنے لنگوٹیا یار کو مشورہ دیا کے یار یہ محی الدین، واحد رحیم، جاوید چیئر مین بن سکتے ہیں تو تم کس سے کم ہو۔ ماشاءاللہ، خان صاحب کے ہفت ایلم میں تم خان کے قریبی ایلم ہو اور احمد زئی سے پہلے دستار تمہارے پُرکھو کے سر پر تھا، تمہاری قبائلی حیثیت بھی ہیں تو چیئر مین بننے کا پورا حق تمہیں بھی ہے، میرا لنگوٹیا یار جیب سے بنونسوار نکال کر ایک چٹکی منہ میں ڈال کر سوچنے لگا، میرا لنگوٹیاں یار شاید بی ایس او کے تاریخ کا پہلا عہدیدار تھا جو بنونسوار کرتا باقی تو ماشاءاللہ سارے بی ایس او والے گولڈ لیف سے کم سوچتے بھی نہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد لنگوٹیا یار نے بڑے تجسس سے پوچھا میں کیسے چیئر مین بن سکتا ہوں؟ میں نے اپنی جیب سے پین نکال کر کاپی پر چند نام تحریر کیے اور پھر اس کا نام چیئر مین کے طور پر لکھا اور باقی جاننے والے دوستوں کے نام مرکزی کابینہ میں ڈال دیئے اور پھر بلوچستان کے مختلف زونوں میں موجود کچھ قریبی دوستوں کے نام گنوانا شروع کیا کہ فلاں فلاں ہمارے ساتھ ہیں۔ دو گھنٹوں کی مجلس میں میرا نسواری دوست خیالوں میں اپنے آپ کو بی ایس او کا چیئر مین سمجھنے لگا اور میری باتوں سے مطمئن ہوا۔ جب ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے تو راستے میں سلام دعا کرنے والوں پر جملہ کسنے لگا کہ ان کم بختوں کو کیا پتہ کے مستقبل کے چیئر مین کو سلام دے رہے ہیں۔

آج اس واقعے کو آٹھ سال گزر رے ہیں لیکن آج جب فیس بک پر مریدوں کو دیکھتا ہوں یا ان کے پوسٹ پڑھتا ہوں تو عجیب لگتا ہے کہ وہ بھی اپنے پیروں کو یہی کہتے ہوں گے کہ سر جی آپ کے فوٹو پر ماشاءاللہ سو لائک آئے ہیں، خواجہ آپ کے پوسٹ پر بہت زیادہ لوگ کمنٹ کرر ہے ہیں، آپ کی تصویر کو شیر کرر ہے ہیں۔ بلوچستان کے لوگ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں بس آپ ہی سب کے مسیحا ہو آپ کسی سے کم نہیں ہو۔

☆☆☆

قوت فیصلہ

ضیاءدلجان بلوچ

رات کے چار بجے اسے ایک سنگت نے نیند سے جگاتے ہوئے کہا" سنگت اٹھو تمہاری ڈیوٹی کا وقت ہے۔" وہ بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہوا پھر اپنی بندوق، جاٹہ اور پانی کی کیتلی لیکر اپنے مورچے کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کا ایک سنگت اس سے پہلے ڈیوٹی پر موجود تھا۔ رات کو کافی بارش ہوئی تھی اور سرما کی راتیں ویسے ہی بہت طویل ہوتی ہیں اس لیے اب بھی گھپت اندھیرا تھا۔ اسے ٹارچ کی روشنی کے بغیر مورچے تک جانا تھا کیونکہ اس اندھیرے میں ٹارچ کے استعمال کا مطلب اپنا پتہ دینا تھا، مورچہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا وہاں تک پہنچتے پہنچتے اسے پانچ بج گئے۔ مورچے پر پہنچ کر اپنے دوست سے ڈیوٹی کا چارج لیتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مشرق سے پھو پھٹنے لگ گئی۔ وہ اپنے بدن میں کافی درد محسوس کر رہا تھا کیونکہ گذشتہ پانچ دنوں سے وہ اور اس کے دوست دشمن کے خونی آپریشن کا مقابلہ کرتے ہوئے لڑ رہے تھے۔ دشمن ہیلی کاپٹروں اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھا اور وہ کلاشنکوف اور چھوٹے ہتھیاروں سے دشمن کا مقابلہ بڑی دلیری سے کر رہے تھے۔ گذشتہ پانچ دنوں سے دشمن کے ساتھ جھڑپ دیتے اور نکل جاتے، پھر دوسری طرف ان کا سامنا دشمن سے ہوتا تو وہ پھر سے کمر بستہ ہو کر لڑتے اور گوریلا حکمت عملی کے تحت نکل جاتے۔ دشمن نے پہاڑی علاقے کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا اور تمام داخلی راستوں کو بند کیا ہوا تھا۔ پانچ دنوں کی جنگ کے دوران وہ صحیح طرح سے کچھ کھائے تھے نہ ہی ٹھیک طرح سے سوئے تھے۔ کیونکہ وہ آٹھ آٹھ کی ٹولیوں میں بٹ چکے تھے اور انہیں دن کے وقت موومنٹ کرنا ہوتا، دن رات ڈیوٹی دینا ہوتا اور دشمن کا سامنا ہونے پر لڑنا اور اپنے دوستوں کو بحفاظت نکالنا بھی ہوتا۔ رات بھر بارش ہونے کی وجہ سے فضا کافی خوشگوار تھی لیکن گذشتہ دنوں سے دونوں طرف سے گولیاں اور دشمن کے دور مار توپوں کے گولوں کی وجہ سے فضا

میں ہر طرف بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے چاروں طرف دوربین سے علاقے کو کلیئر کر دیا۔اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ رات کو ہونے والی بارش اور تیز ہواؤں نے دشمن کو بھی واپسی پر مجبور کر دیا ہے۔وہ دوربین سے چاروں طرف جائزہ لینے سے فارغ ہوا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔آسمان پر اب بھی کچھ کچھ بادل چھائے ہوئے تھے پُر فضا موسم دیکھ کر وہ اپنے ماضی میں چلا گیا۔اسے یاد آ رہا تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ کوئٹہ جا رہا تھا وہ بھی اسی طرح سردیوں کے دن تھے۔اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کوئٹہ میں اس موسم میں کتنی سردی ہوتی ہے کیونکہ وہ بلوچستان کے کسی گرم علاقے میں رہتا تھا۔وہ پہلی مرتبہ ایک نوکری کے سلسلے میں کوئٹہ جا رہا تھا۔ساری رات بس میں سفر کرنے کے بعد جب وہ کوئٹہ پہنچا تو بس سے اترتے ہی اسے احساس ہوا کہ یہاں کتنی سردی ہوتی ہے اسے اپنے ساتھ جیکٹ لانا چاہیے تھا۔وہ کافی پشیماں تھا،بس کی ٹکٹ لیتے وقت ٹکٹ دینے والے بس کے منشی نے کہا تھا کہ کوئٹہ جا رہے ہو وہ بھی کسی جیکٹ وغیرہ کے بغیر؟اس وقت اس نے منشی کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اب اس کی کہی ہوئی بات اسے شدت سے یاد آ رہی تھی۔بس سے اترنے کے بعد اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا،وہ جلدی سے روڈ کراس کر کے سامنے والے ہوٹل میں داخل ہوا،ہوٹل میں داخل ہوتے ہی اسے گرمائش کا احساس ہونے لگا کیونکہ ہوٹل میں ہیٹر جل رہے تھے۔اس نے اپنے لیے چائے پراٹھے کا آرڈر دیا اور ٹیبل کے ساتھ موجود کرسی پر بیٹھ گیا،اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا سب لوگ سردی سے بچنے کے لیے کوٹ اور دستانے پہنے ہوئے تھے سوائے اس کے۔وہ اب بھی سردی سے کانپ رہا تھا،ناشتہ کرنے کے بعد آدھا گھنٹہ وہیں بیٹھا رہا لیکن اسے نکلنا بھی تھا جہاں اس کی انٹری ٹیسٹ ہونی تھی اس جگہ کا پتہ معلوم بھی کرنا تھا۔وہ جیسے ہی ہوٹل سے نکلا تو سردی نے ایک مرتبہ پھر اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔وہ چند قدم بمشکل چل سکا تھا کہ سردی سے اسکے پاؤں شل ہونے لگے۔ وہ جلدی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔نزدیک ہی اسے ایک اور ہوٹل نظر آیا،ہوٹل میں جانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا،وہ جلدی سے ہوٹل میں گھس گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔بیٹھنے کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ویٹر اس کے قریب آیا اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا ''لالا سندھی ہو؟''۔''نہیں

بلوچ ہوں کیوں؟''اس نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔ ویٹر نے کہا''نہیں ویسے آپ نے نا کوٹ پہنا ہے اور ناہی کوئی جرسی میں سمجھا آپ سندھی ہو کیونکہ سندھ میں اس موسم میں بھی گرمی ہوتی ہے اکثر سندھ کے لوگ کوئٹہ آ کر یہی غلطی کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ سندھ میں گرمی ہے تو کوئٹہ میں اتنی سردی نہیں ہوگی اور یہاں آتے ہی آپ کی طرح کانپنے لگتے ہیں، چلو خیر آپ کیا لینا پسند کروگے''۔''ایک کپ چائے''۔دوبارہ سے چائے پی تو اسکے جسم میں تھوڑی حرارت پیدا ہوگئی، جیسے ہی گھڑی پر نظر پڑی تو آٹھ بج رہے تھے، وہ ہوٹل سے نکلا اور سردی سے کانپتے ہوئے رکشے والے سے بات کی رکشے والے نے کچھ زیادہ پیسے بتائے کیونکہ اسے جہاں جانا تھا وہاں تک اتنا کرایہ نہیں بنتا تھا، لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے جہاں جانا ہے وہ جگہ کتنی دور ہے۔ وہ رکشے میں بیٹھ گیا اور رکشہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا اسے عسکری پارک کے قریب آئی ایس ایس بی سینٹر کے سامنے روڈ پر اتار دیا۔ رکشے والے کو کرایہ ادا کر کے وہ آئی ایس ایس بی سینٹر کی جانب روانہ ہوا۔ گیٹ پر اس نے اپنے آنے کا مقصد بتایا اور اپنا شناختی کارڈ و کال لیٹر دکھا کر اندر داخل ہوا۔

اس نے دیکھا کہ اس سے پہلے بھی کافی لڑکے سینٹر آئے ہوئے تھے۔ چائے پلانے کے تھوڑی دیر بعد ان کو نمبر ایشو کیے گئے اور ایک بڑے سے ہال میں داخل ہونے کو کہا گیا۔ آج سیکنڈ لیفٹینینٹ کے لیے ان کا انٹری ٹیسٹ ہونا تھا۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنا رول نمبر والا ڈیسک ڈھونڈنے لگا جو اسے جلد ہی نظر آ گیا اور وہ وہیں بیٹھ گیا، بیٹھنے کے بعد ہال میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اسے اکثر پنجابی، پشتون اور دیگر زبانیں بولنے والے لڑکے نظر آئیں۔ اب تک اسے چند ایک بلوچ ہی نظر آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں کوسچن پیپر دیئے گئے جو کہ ایک ساتھ مختلف مضامین کے تھے۔ وہ پیپر کو غور سے پڑھنے لگا بہت سے سوال اس کے لیے انتہائی آسان تھے کیونکہ زیادہ تر ٹک مارک کرنے والے تھے اور وہ ویسے بھی اپنی کلاس میں اچھا اسٹوڈنٹ تھا اور علاقے میں ہونہار لڑکوں میں شمار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان میں سب سے لائق بھی وہی تصور کیا جاتا تھا۔ کھیل کھود کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تعلیم پر بھی زیادہ توجہ دیتا، لیکن اپنے باقی دوستوں اور کزنوں کی طرح آوارہ گردی نہیں کرتا۔ اس نے مقررہ وقت سے پہلے تمام سوالوں کو حل کر کے اپنا پیپر واپس جمع کر دیا اور باہر نکل

گیا۔ دوسرے بہت سے لڑکے بھی باہر نکل گئے ہر کوئی اپنے جاننے والے سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے ٹیسٹ کیسے دیا، وہ یہی کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک نوجوان اس کے پاس آیا سلام دعا کے بعد پوچھتے ہوئے کہا ''بلوچ ہو؟'' اس نے اپنا نام ذاکر بتاتے ہوئے کہا کہ ''جی ہاں میں بلوچ ہوں'' پھر اس نے مخاطب سے اس کا تعارف پوچھا۔ ''میرا نام انیس ہے اور میں مستونگ کا رہنے والا ہوں اس نوجوان نے جواب دیا'' کیسا رہا ٹیسٹ؟''، ''دوست تمام سوال حل کر دیے اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے''۔ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں گیٹ تک آ گئے۔ ایک رکشہ لیکر بازار پہنچ گئے دونوں نے ایک ہوٹل میں چائے پی اور ایک دوسرے سے اپنے موبائل نمبروں کا تبادلہ کیا۔ اس نے انیس سے کہا کہ مجھے بلوچستان یونیورسٹی جانا ہے۔ انیس نے کہا پھر چلو لوکل بس میں چلتے ہیں، تم یونیورسٹی اتر جانا میں آگے چلا جاؤں گا۔ دونوں سریاب کی لوکل بس میں سوار ہو کر روانہ ہوئے، تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی کا گیٹ پہنچ گیا، وہ انیس کو خدا حافظ کہہ کر لوکل سے اتر گیا اور اپنے دوست علی کو کال کی جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد علی گیٹ پر آ کر اسے ہاسٹل لے گیا۔ علی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جلدی سے ایک کمبل اوڑھتے ہوئے کہا ''یار یہ کوئٹہ کتنا سرد ہوتا ہے''۔ ''یار ابھی تک کہاں ہیں سردیاں'' علی نے ہنستے ہوئے کہا، ''سردی تو جنوری فروری میں ہوتی ہے۔ علی نے اس کے لیے چائے بنائی اور دونوں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ علی کے کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا جن پر مختلف تصویریں چسپاں تھیں۔ اکثر تصویروں کے نام سے پہلے شہید یا اسیر لکھا ہوا تھا۔ اس نے علی سے پوچھتے ہوئے کہا یار یہ تصویریں تم نے کیوں لگائی ہیں؟ کیوں یہ تصویریں مجھے نہیں لگانی چاہیے تھیں؟ علی نے استفسار کیا۔ ہاں یار میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں کہ ان تصویروں کو کیوں لگائے ہوئے ہو اور یہاں تم کسی تنظیم میں تو شامل نہیں ہو؟ ہاں میں بی ایس او کا ممبر ہوں علی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ اس نے کہا چھوڑو یار ان تنظیموں کے قریب کب سے ہوئے اور ان تصویروں کو چسپاں کر کے تم کیا دکھانا چاہتے ہو، تم غلام ہو؟ علی نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ہاں یار میں تو یہی سمجھتا ہوں شاید تم نہیں سمجھتے اس لیے فوج میں بھرتی ہونے کے

لیےٹیسٹ دے کر آئے ہو اور اس گھمنڈ میں ہو کہ فوج میں بھرتی ہو کر اپنے ملک وقوم کی خدمت کرو گے۔ ہاں یہی میری سوچ ہے اس نے کہا۔علی نے سوالیہ لہجے میں اس سے پوچھا، اچھا پھر تم بھی ہمارے اوپر ظلم کرو گے ان نوجوانوں کی طرح تم بھی ہم میں سے کچھ کو شہید کرو گے۔اب بحث بہت زوروں سے جاری تھی یہاں تک کہ علی اس پر ایک دو مرتبہ جذباتی بھی ہوا۔آخر علی نے اپنے آپ کو کنٹرول کیا کیونکہ ذاکر جیسا بھی تھا اس کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا مہمان بھی تھا۔رات کے آٹھ بج گئے تھے علی نے اپنی الماری سے ایک پرانی کوٹ نکال کر ذاکر کو دی اور کہا چلو کھانا کھانے کے لیے میس چلتے ہیں۔دونوں کمرے سے نکل کر میس کی طرف روانہ ہوئے راستے میں جو بھی علی کو دیکھتا تو کہتا'' کامریڈ چے حال اے'' دونوں میس پہنچے کھانا لیا اور بیٹھ کر کھانے لگے۔کھانے سے فارغ ہو کر علی نے سگریٹ نکالتے ہوئے اسے پینے کی آفر کی تو اس نے منع کر دیا، پھر دونوں میس سے باہر نکل گئے۔ابھی باہر نکلے ہی تھے کہ ایک نوجوان نے علی کو دیکھا اور کہا کامریڈ آج ہمارے کمرے میں کسی دوسرے زون سے چند دوست آئے ہیں چلو وہی پر چلتے ہیں۔علی نے کہا چلو چلتے ہیں، پھر تینوں روانہ ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے ایک پرانے دوست کو دیکھا، اس کے ساتھ گرم جوشی کے ساتھ ملا۔سب بیٹھ گئے حال احوال کے بعد مجلس شروع ہوئی پھر رات دیر تک ان کی یہ سیاسی بحث چلتی رہی، جبکہ وہ اپنے دوست کے ساتھ باتیں کرر ہا تھا وہ اور اس کا دوست پرائمری تک ایک ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے اور کافی اچھے دوست تھے۔اس کے بعد اس کا یہ دوست پنجگور چلا گیا آج کئی سال بعد ملاقات ہوئی تو وہ بہت سی پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے محظوظ ہورہے تھے۔باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ اس کا دوست بھی بی ایس او کا ممبر ہے، رات کافی گزر چکی تھی وہ اٹھ گئے اور دوستوں سے خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل کر علی کے کمرے کی جانب روانہ ہوئیں۔راستے میں وہ سوچ رہا تھا اگر اس کا دوست وہاں نہ ہوتا اور اس کے ساتھ مجلس نہ کرتا تو وہ علی اور اس کے دوستوں کی باتوں سے بہت بور ہو جاتا، وہ دونوں کمرے میں پہنچ کر سونے کی تیاری کرنے لگے۔

علی نے پھر سے پوچھا'' یار واقعی تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟'' ذاکر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

دریافت کیا کیوں؟علی نے کہا یار تمہارے مارکس اچھے ہیں تم کسی اور محکمے میں نوکری کیوں نہیں ڈھونڈتے۔ بہتر ہے تم کوئی اور نوکری تلاش کرو۔ یہ پنجابی فوج میں بھرتی ہونے کا خیال دل سے نکال دو۔ شاید آپ کو میری باتیں اچھی نہ لگے لیکن حقیقت میں یہ ہماری دشمن فوج ہے اور آپ ایک کرائے کے قاتل کی حیثیت سے بھرتی ہونے جارہے ہو۔ اس نے کہا نہیں یار باقی محکموں میں نوکری کہاں ملتی ہے وہاں تو نوکری بڑے لوگوں کی سفارش پر ملتی ہے یا پھر آدمی کے پاس بڑی رقم ہونی چاہیے۔ اور تم جانتے ہو میرے لیے کون سفارش کرے گا۔ علی نے کہا دوست آج ان حالات کو دیکھنے کے بعد سوچنا چاہیے کہ تمھیں فوج میں جانا چاہیے کہ نہیں اور ہاں یہ بتاؤ میرے ساتھ اور کتنے دن رہو گے؟ بس دو دن کے بعد چلا جاؤں گا اس نے جواب دیا۔ علی نے کہا یار ایک ہفتہ رک جاؤ پھر چلے جانا۔ نہیں یار اس دفعہ جاتا ہوں اگر ابتدائی ٹیسٹ پاس ہوا تو انٹرویو کے لئے جب آؤں گا تو ایک ہفتہ رکوں گا لیکن اِس دفعہ نہیں۔ رات کو وہ سو گئے اور صبح دیر سے اٹھ گئے تھوڑی دیر بعد اس کے دوست نے اسے کال کیا اور پوچھا کہاں ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وہ علی کے کمرے میں ہے۔ دوست نے کہا ٹھیک ہے میں وہیں آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دوست آیا دونوں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ علی نے اس کے دوست سے کہا یار اپنے دوست کو سمجھاؤ یہ پنجابی فوج میں بھرتی ہونے آیا ہے میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن میری باتیں اس کے دماغ میں نہیں گھستی ہیں۔ اس دوست نے بھی اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی یار یہ کیا کررہے ہو مت جاؤ دشمن فوج میں لیکن وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ خیر دو دن بعد وہ اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ علی کو خدا حافظ کہہ کر وہ بس میں بیٹھ گیا اور بس روانہ ہوئی۔

ابھی بس لک پاس ٹنل سے نہیں گزری تھی کہ اسے بریک لگانی پڑی۔ ڈرائیور نے تمام مسافروں کو اترنے کو کہا، اس نے بس کے اگلے شیشے سے باہر دیکھا تو فورس کی بہت سی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں، وہ سب جیسے ہی اترنے کے لیے اٹھے تو فورس کے چند اہلکار بس میں داخل ہوئے اور سب کو واپس بیٹھنے کا حکم جاری کیا۔ پھر باری باری سب کے چہروں کو دیکھنے لگے۔ ایک اہلکار تھوڑا آگے بڑھا اور بیچ والی سیٹ سے ایک نوجوان کو کالر سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا اور اس کا نام پتہ پوچھنے لگا۔ اس نوجوان کے ساتھ ایک خاتون اور دو بچے بھی تھے۔ جیسے ہی اس

نے اپنا نام اور پتہ بتایا تو اہلکار نے اسے مارنا اور گالی دینا شروع کر دیا۔ بچے خوف کی وجہ سے رونے لگے اور خاتون بھی رونے لگی۔ وہ نوجوان شاید اس کا شوہر تھا، اس نے اپنے شوہر کو اہلکاروں سے چھڑانے کی کوشش شروع کر دی تو دوسرے سپاہیوں نے عورت کے سر پر بندوق کا بٹ دے مارا۔ عورت کے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ پہلے والا سپاہی اب بھی اس نوجوان پر مکّے برسا رہا تھا اور اسے گالیاں بھی دے رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا بڑے کمانڈر بنے پھرتے ہو دہشت گرد کی اولاد تمہارا باپ بھی بلوچستان کو پاکستان سے جدا نہیں کر سکتا۔ اس نوجوان کو مار مار کر لہولہان کر دیا اور بس سے اتار کر گھسیٹتے ہوئے اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ وہ عورت اور بچے ابھی تک رو رہے تھے۔ فورس کے جانے کے بعد عورت گلوگیر انداز میں بس میں موجود مرد مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تم لوگوں میں کوئی بلوچی غیرت نہیں تھا کہ وہ دری سپاہی آ کر میرے شوہر کو لے گئے اور تم سب دیکھتے رہ گئے۔ میرا شوہر کوئی چور یا ڈاکو نہیں بلکہ وہ تم لوگوں کے کل کو بہتر کرنے کی خاطر دشمن کی گالیاں اور لاتیں برداشت کر رہا تھا، لیکن تم سب اسے مار کھاتے دیکھتے رہیں، عورت انہیں سنا رہی تھی اور سب لوگ خاموش تھے۔ ان میں ذاکر بھی تمام لوگوں کی طرح سر جھکائے خاموشی سے بس کی فرش کو تک رہا تھا، وہ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سفر جاری تھا کچھ دوسری عورتیں اس عورت اور اسکے بچوں کو تسلی دے رہے تھے۔ جب ذاکر کا علاقہ پہنچ گیا تو وہ بس سے اتر کر گھر چلا گیا۔

دو دن بعد اس نے بس میں ہونے والے واقعے کو بھلا دیا، اب وہ اپنے انٹرویو لیٹر کے انتظار میں تھا اس دوران اس کا رابطہ اپنے پرانے دوست سے فون پر رہتا تھا۔ پندرہ دن بعد اس کے ایڈریس پر انٹرویو لیٹر بھی پہنچ گیا۔ اب دو دن بعد پھر اسے کوئٹہ جانا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اس بار پہلے کی طرح وہ نہیں جائے گا، وہ بازار گیا اپنے لیے بوٹ اور جیکٹ خرید لیا۔ خریداری کے بعد وہ ایک ہوٹل میں چائے پینے کے لیے چلا گیا، اس نے دیکھا دوسرے نزدیکی ٹیبل پر چار نوجوان بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی زور و شور سے ان کے درمیان سیاسی بحث جاری تھی، وہ چائے پی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر پڑی کہ ہوٹل کے باہر سامنے فورسز کی کہیں گاڑیاں آ کر رک گئیں۔ گاڑیوں سے فوج کے اہلکار اترنے لگے اور ہوٹل کو گھیرے میں لے لیا، کچھ اہلکار ہوٹل میں داخل ہو گئے

اور ہوٹل میں موجود تمام لوگوں کی چیکنگ شروع کر دی۔ ایک اہلکار نے اس کی بھی تلاشی لی، جب اس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اسے ایک فوجی اہلکار نے زور سے تھپڑ رسید کیا باقی اہلکاروں نے ان دیگر نوجوانوں کی تلاشی لی اور انہیں مارنا شروع کر دیا۔ ان کو مارنے اور قابو کرنے کے لیے چند اہلکار اور بھی آ گے آ گئے۔ ان نوجوانوں کو مارتے ہوئے پھر سے وہی گالیاں اور باتیں شروع کیں کہ تم پاکستان کو توڑنا چاہتے ہو، انہیں گاڑیوں میں ڈال کر روانہ ہوئے۔ وہ تھپڑ کھانے کے بعد گھر کی طرف روانہ ہوا اور پورے راستے میں اسے سفر کے دوران بس میں ہونے والے واقعے اور ہوٹل میں ہونی والی باتیں یاد آنے لگیں، اسے ایسے لگنے لگا کہ وہ بچے آج بھی رو رہے ہیں۔ اب علی اور اس کے دوست کی باتیں اسے شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ گھر کیسے پہنچ گیا۔ پورا دن یہی دونوں واقعات اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ رات کو والدہ نے کہا بیٹا سو جاؤ صبح تمہیں انٹرویو کے لیے کوئٹہ جانا ہے، میں صبح اٹھ کر تمھارے لیے دعا کروں گی کہ خدا تمہیں انٹرویو میں کامیاب کرے اور تمھیں نوکری مل جائے۔

کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ وہ اپنا انٹرویو لیٹر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ جس نوکری کے لیے جس خوشی سے ٹیسٹ دے کر آیا تھا اب انٹرویو لیٹر کو دیکھ کر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ نوکری کرے۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح جب اس کی والدہ نے اسے جگایا تو رات دیر سے سونے کی وجہ سے وہ بڑی مشکل سے اٹھ سکا۔ غسل کر کے ناشتہ کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا، اس کا دل جانے کے لئے نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ والدہ کو کیا جواب دوں گا کہ میں انٹرویو کے لیے کیوں نہیں جا رہا ہوں۔ اس نے بادل نخواستہ اپنا بیگ اٹھایا تو ماں نے بہت سی نیک دعائیں دینی شروع کی۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے اور تم ایک بڑا افسر بن کر لوٹو۔ گھر سے نکل کر رکشے میں بیٹھ گیا اور بازار میں اتر کر بس کی روانگی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بس بھی روانہ ہو گیا، راستے میں جو شہر یا کوئی گاؤں آتا تو اسے فورسز کی چوکیاں نظر آتے، حالانکہ یہ چوکیاں پہلے بھی موجود تھیں لیکن اس سے پہلے وہ اپنے دل میں ان کے خلاف اتنی نفرت محسوس نہیں کرتا تھا۔ آج جس چوکی کو دیکھتا یا کوئی فورس

کی گاڑی اسے نظر آتی تو اسے وہ عورت کی چیخیں ان بچوں کا بلکنا اور وہ نوجوان یاد آتے اور ساتھ ساتھ اسے اپنی بےعزتی کا وہ تھپڑ بھی یاد آتا۔ کوئٹہ پہنچنے کے بعد وہ سیدھا علی کے پاس آیا کیونکہ اس کا انٹرویو تین دن بعد تھا، رات کو وہ علی کے پاس رہا تو وہ دونوں واقعات علی کو سنائے۔ علی نے کہا دوست بلوچستان کے کونے کونے میں ایسے سینکڑوں واقعات روزانہ رونما ہوتے ہیں، رات دیر تک وہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور سو گئے۔ دوسرے دن علی نے پوچھا یار تمہارا انٹرویو کب ہے۔ اس نے کہا دو دن بعد، علی نے پھر سے وہی سوال دہراتے ہوئے کہا تو تم سچ مچ فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟ اس نے کہا ہاں ضرور میں فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں لیکن ضروری نہیں میں پنجابی کے فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ علی نے پھر سے حیران ہو کر پوچھا پھر کس فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟ اس نے کہا اپنی فوج میں، بلوچوں کی فوج میں بی ایل اے میں۔ اس نے مزید زور دیتے ہوئے کہا اس کے لیے تمہیں میرے اوپر بھروسہ کرنا ہوگا، میرے لیے راستہ ڈھونڈنا ہوگا۔ میں انٹرویو دینا نہیں چاہتا اور گھر بھی نہیں جانا چاہتا کیونکہ میں اگر گھر گیا تو مجھے بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یار تم ڈھونڈو اور بی ایل اے کیمپ روانہ کرنے میں میری مدد کرو وہ مسلسل بولے جا رہا تھا، علی نے رازدارانہ انداز میں کہا کہ یار میں کسی کو نہیں جانتا۔ اس نے علی سے کہا جو کرنا ہے تمہیں کرنا ہے میں واپس گھر نہیں جاؤں گا۔ علی نے اس سے مزید کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن اس کا انٹرویو تھا لیکن وہ نہیں گیا اس نے اپنا انٹرویو لیٹر علی کے سامنے پھاڑتے ہوئے کہا میں یہاں سے تب تک نہیں جاؤں گا جب تک تم میرے لیے بی ایل اے تک کا راستہ نہیں ڈھونڈتے۔ علی نے بہت سمجھایا یار میں کسی کو نہیں جانتا، اس نے کہا میں یہی تمہارے ساتھ رہ کر انتظار کروں گا اور کہیں نہیں جاؤں گا۔

اسے علی کے یہاں رہتے ہوئے دس دن گزر گئے تھے، گھر سے بھی بار بار فون آ رہے تھے اور ہر بار اس سے یہی سوال ہوتا کہ انٹرویو کیسے دیا اور گھر کب آ رہے ہو، وہ گھر والوں کو ٹالتا رہا کہ کہ جلد گھر آؤں گا۔ گیارہویں دن علی پڑھنے کے بعد واپس آیا تو علی کے ساتھ اس کا دوست بھی تھا۔ اس نے دوست کے ساتھ سلام دعا کے بعد بیٹھ کر باتیں شروع کیں، باتوں باتوں میں اس کے دوست نے کہا یار علی کہہ رہا تھا کہ تم انٹرویو دینے نہیں گئے

ہواور کہہ رہے ہو کہ مجھے بی ایل اے میں شامل ہونا ہے۔اس نے کہا ہاں بالکل، پھر وہ اس موضوع پر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اسے بتایا گیا کہ سنگت یہ سفر بہت لمبا ہے اس میں سوچ سمجھ کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ آپ ایسے جذباتی پن میں نہیں کر سکتے، جذبات سے تو بندہ کچھ دن سفر کر سکتا ہے اس میں مستقل مزاجی نا ہوتو وہ ٹوٹ جاتا ہے تھک جاتا ہے۔انسان کو کسی بھی حالت میں کیفیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے یوں تو انسان کے احساس کو جگانے کے لیے ایک واقعہ ہی کافی ہے لیکن پھر بھی آپ کو ہر پہلو پر غور کرنا ہوگا۔ یہ جنگ ہے اس میں کسی بھی قدم پر کچھ بھی ہوسکتا ہے، گھر تباہ ہوتے ہیں اپنے پیارے بچھڑتے ہیں اوران سپنوں کے بکھرنے کا خطرہ ہوتا ہے جو ہم نے اپنی اپنی دنیا میں بُنے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر دلعزیز سنگت بچھڑتے ہیں جنہیں ہم خود اپنے ہاتھوں سے کاندھا دے کر اٹھاتے ہیں اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے دفن کرتے ہیں اسی غم اور انتقام کے ساتھ پھر سے ایک جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔ یہاں نام ونمود، شہرت، دستار، کمانڈری، لیڈری کی غرض ولالچ سے بیگانہ ہوکر ہر قدم پر بے غرض بےلوث خدمت وجدوجہد کرنا پڑتا ہے۔اس وقت تم جذباتی ہو جبکہ یہ کام جوش سے نہیں ہوش سے کیا جاتا ہے۔اس نے کہا نہیں یار میں جذباتی نہیں ہوں میں نے بہت سوچا ہے میں جو قدم اٹھانے جارہا ہوں وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھارہا ہوں اور آج مجھے اچھی طرح میری قومی غلامی کا احساس ہے کاش اگر ہم پہلے ملے ہوتے تو آج آپ دونوں کو یوں بار بار یقین دہانی کی نوبت نہیں آتی۔ وہ بولے جارہا تھا اوراس کی سرخ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، جواس کے زرد رخساروں سے بہہ کر دھار بنارہے تھے۔اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا دوست کیا ہم ایک قوم ایک سرزمین کی کوکھ سے جنم لیکر بھی پھر سے کسی ایک خاندان یا ذات میں قید ہو سکتے ہیں؟ کیا اپنوں سے بچھڑنے والا یا اپنی آنکھوں سے اپنے سپنے بکھرتے دیکھنے والا پہلا بلوچ میں ہی ہوں؟ اگر کسی ہر دلعزیز کی جدائی مجھے تارتار کردیگی تو کیا کسی سنگت کا میرے لیے تڑپنا میری زیست کا سامان نہ ہوگا؟ کیا کسی بے بس انسان کو جو اپنی ماں بہنوں کی آنسو دیکھ کر احساس پالیتا ہے پھر سے اسی بے بسی میں تڑپتے رہنے دوگے؟ یہ باتیں سن کر اس کے دونوں دوست لاجواب ہوکر رہ گئے۔اب ہر طرف خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد اس کے دوستوں نے کہا چلو بازار چلتے ہیں، لیکن اس نے اپنے دوستوں کو منع کرتے ہوئے کہا دوست آج مجھے اکیلے رہنے دو میں آج خود میں کھونا

چاہتا ہوں۔اپنی ماضی میں کھونا چاہتا ہوں اپنے رشتوں کو پھر سے مضبوط کرنے کے لیے بکھیرنا چاہتا ہوں، میں ان بندھنوں کو ایک بار جھنجھوڑنا چاہتا ہوں جو آج تک میرے پاؤں میں زنجیر بن کر میرا رستہ روکے رہے۔ دوسرے دن اس کے دوست نے اسے ایک اور بندے کے ساتھ ملایا، وہ بندہ اسے لیکر روانہ ہوا اب وہ بولا ان کی طرف جا رہے تھے۔دو دن بعد کیمپ پہنچ گئے، وہاں نئے لوگ، نئی جگہ، نئی سوچ تھی۔پہنچتے ہی اسے اپنائیت کا احساس ہونے لگا۔چالیس کے لگ بھگ لوگوں کے چہروں پر ایک نظر دوڑانے کے بعد اسے زرہ برابر بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کچھ اجنبی لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوں۔

آج اسے تین سال ہو گئے تھے۔کبھی کبھار فون پر گھر والوں سے رابطہ ہوتا وہ تین سالوں سے کبھی شہر بھی نہیں گیا تھا۔اسی دوران دور سے آتی ہوئی بھاری آواز نے اسے سوچوں کی دنیا سے واپس نکال دیا۔اس نے دیکھا وہ بھاری آواز مزید تیز ہو رہی تھی۔وہ سمجھ گیا کہ دشمن کا جاسوس طیارہ ہے۔اس نے مخابرہ اٹھایا اور اپنے دوستوں کو جاسوس طیارے کے آنے کی اطلاع دی۔

☆☆☆

مشکل ہیں، ناممکن نہیں

ضیاء دلجان بلوچ

شاہموز کی ننھی سی سورج کی کرنیں جب میرے زہری کو روشن کرتے ہیں تو ہر طرف ایک خوبصورت سما ہوتا ہے۔ ایک خوبصورت منظر درختوں کا ہوتا ہے، ایک خوب صورت منظر جب کسان زمینوں پر کام کررہے ہوتے ہیں، ایک خوب صورت منظر جب شوان لاٹھی کاندوں پر لیے خلکی شعر گنگناتے مال مویشوں کو چرہانے شاہموز کی پہاڑی سلسلے کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ ایک بہت خوبصورت وادی جس میں شہید سفر خان وطن پر قربان ہوکر ابدی نیند سورہا ہے لیکن سفر خان کی شہادت کے بعد اس سے اپنے سفر خان کے چنے ہوئے راستے سے الگ ہوگئے اور اپنی ذاتی زندگی میں مصروف ہوگئے۔ ان میں سے کئی نوروز خان کے خاندان کی طرح سرکار کے تالی چٹ بن گئے۔ سفر خان کے وقت آج کا زہری جو کبھی قومی تحریک کا مرکز ہوا کرتا تھا لیکن آج سفر خان کا زہر بے راروی کا شکار ہے۔ آج کے نوجوانوں کو اپنے قومی حقوق اور قومی غلامی کا کوئی احساس ہی نہیں، آج کے نوجوان تو عشق عاشقی، پکنک اور کھیل میں مصروفہیں انہیں اپنے اردگرد تک کا کچھ معلوم نہیں کہبلوچستان میں کیا ہورہا ہے، لوگ اغوائہورہے ہیں، گھر جل رہے ہیں، بلوچ زالبول کی عصمت لٹ رہی ہے، گاؤں کے گاؤں دشمن نے جلا دیئے، نوجوان دشمن کیعقوبت خانوں میں ظلم سہہ رہے ہیں۔ ان تمام حالات سے بے خبر میرا نوجوان رات دیر تک نیٹورک پر بیٹھ کر اپنے محبوب سے فون پر وقت گزاری کرتا ہے اور صبح دیر تک سویا رہتا ہے، جب دوپہر کے وقت بازار کے لیے نکلتا ہے تو چیرے پرسن بلاک کریم لگا کر نکلتا ہے تا کہ چہرے کی سفیدی کم نا ہو، شام کو سپرائٹ کی بوتل لیکر دوستوں کے ساتھ سوہیندا کی طرف جا کر ٹائم پاس کرنا یا پھر فٹ بال کو سب کچھ سمجھنا عجیب حالت ہے۔ ایک طرف یہ سبہیتو دوسری طرف سردار کے ظلم ستم کی داستانیں موجود ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ طالبان ازم بھی سرکار کی سرپرستی میں بڑے آرام سے پھیل رہا ہے،

معصوموں کو مدرسوں سے بھرتی کیا جاتا ہے، ملا تو اتنے آزاد ہیں اگر آپ چند دن تسلسل کے ساتھ مسجد جائے، نماز پڑھنے تو پہلے ہی ہفتے میں جمعہ سے پہلے پہلے ایک باریش شخص آپ کی قربت حاصل کرنا شروع کرتا ہے اور پھر موقع دیکھ کر نوجوان نمازی کو کشمیر اور افغانستان میں جہاد کے لیے ترغیب دینا شروع کرتا ہے، وہ نوجوان نوجوانی کی جوش میں اگر کسی اور کی سرزمین پر کسی اور کے جنگ کا ایندھن بن جاتا ہے پھر ایک باریش مولانا اس کے گھر تشریف لیجا کر ان کے گھر والوں کو کہتا ہے کہ آپ کا بیٹا شہید ہو گیا ہے، نہ اس کے والدین کو پتہ کہ وہ کس کے لیے شہید ہوا نہ اس نوجوان کو کچھ معلوم کہ وہ کس کے لیے کمائی کا ذریعہ بننے جا رہا ہے۔ تیسری طرف قبائلی سوچ قبائلی دشمنی بھی اس قبیلہ اس علاقہ کو پیچھے رکھنے میں بڑھا کردار ادا کر چکا ہے۔ جب یہاں کوئی قبائلی مسئلہ ہوتا ہے تو بڑے بزرگ نوجوانوں کو کہتے ہیں کہ بندوق اٹھاؤ اپنے ہمسایہ کے خلاف کہ غیرت کا معاملہ ہے لیکن افسوس اس بزرگ کی سوچ پر جب وہ ویگن میں سوار ہوتا ہے خضدار جانے کے لیے تو انجیرہ کراس پر سرکار اور سردار کے سپاہی انہیں گاڑی سے اتار کر ان کی جامع تلاشی لیتے ہیں، ان کے سر پر باندھے بلوچی دستار تک کو اتارتے ہیں تب میرے اس بزرگ کو اپنی عزت اور غیرت کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک غیر قوم کا سپاہی میری زمین پر مجھ سے میرا شناخت پوچھ رہا ہے، تنگ نظری عدم برداشت، قبائلی سوچ، بے راہ روی، ملا ازم، سردار سرکار ان سب کے ہونے کے باوجود اب بھی گنجائش ہے کہ یہاں کئی ہیرے موجود ہیں جنہیں ڈھونڈ کر تراشہ جاسکتا ہے، ابھی بھی قومی سوچ دماغ کے کسی کونے میں ہے بس اسے مناسب موقع پر آگے لانا ہے، کام کرنا ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے لیکن ہر مشکل کے بعد ایک انقلاب آتا ہے، وہ انقلاب سب کے لیے ہوتا ہے، کسان سے لیکر شوہان تک، طالب علم سے لیکر ٹیچر تک سب کے لیے یکساں لیکن ایک صبر آزما آزمائش کے بعد۔

☆☆☆

Kill the fear or let it to kill you

ضیاءدلجان بلوچ

سنگت خوف عجیب ہے یا تو تم اسے ماردو یا اسے چھوڑ دو کہ یہ آپ کو مار دے،اسے مارنا ہی بہتر ہوگا۔ ہمارا کام خطرے سے خالی نہیں ہے لہٰذا ہمیں اس کے لیے خود کو خطرناک بنانا ہوگا۔ وقت وحالات چاہے جیسے بھی ہوں وہ آپ سے وابستہ ہیں کہ تم انہیں کس طرف لے جاتے ہو اور آپ کے کام کرنے کا طریقہ کیا ہے، جنگ جتنی تیز ہوگی اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے اور بات قربانی کی ہے تو یہ اس کام سے وابستہ ہے،اس راستے پہ بہت سے ایسے واقعات ہمارے سامنے پیش ہونگے جو ایک مایوس کن حالت پیدا کردے۔ انسانی ذہن خیالات کا سمندر ہے مگر ہمیں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے اور ہمیں ان جیسے ہر حالات سے نمٹنا ہوگا اگر کمزور پڑ جائیں تو کام میں کمزوری آئے گی اور منزل تک پہنچ پانا بہت ہی مشکل ہوگا۔ ڈر ایک گوریلا کی موت ہے اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے اسے ختم کرنا ہوگا۔ بات رہی حوصلے کی،سب سے بڑا حوصلہ ہم خود ہیں اپنے لیے کیونکہ آپ کا ذہن آپ ہی کا پابند ہے کہ آپ اسے کیسا رخ دیتے ہو اور کیسی شکل دیتے ہو۔ مستقل مزاجی سے کام کو لے جانا ہے کبھی آہستہ تو کبھی تیز مگر اسے روکنے کی اور دستبردار ہونے کی سوچ کو ختم کرنا ہے۔ آج اگر "فیڈل کاسترو" اپنے مقصد سے دستبردار ہوتا اپنے پہلی ناکامی دیکھ کر تو شاہد کیوبا کی عوام آج تک غلامی میں زندگی بسر کررہی ہوتی۔ ہمارے کئی ہمراہ کئی ساتھی ہم سے بچھڑے ہیں اور آنے والے وقت میں بھی ایسے دن دیکھنے کو اور خبر سننے کو ملینگے،شاہد ہم ہی نہ ہوں اگر میں نہ ہوں تو آپ کو اور آپ نہ ہو تو مجھ پہ فرض ہے کہ ایک دوسرے کی بندوق سنبھال کر دشمن کو چین کی نیند سونے نہ دیا جائے۔ یہ وطن ہمارا ہے اور ہمیں اس پر غیروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جارہا ہے مگر ہمیں دشمن کو باور و یقین دلانا ہوگا کہ غیر ہم نہیں غیر تم ہو۔

☆☆☆

وطن کا عاشق

ضیاء دلجان بلوچ

منگل 24 فروری، 2015

کانٹوں سے سجی ہوئی پرخار درد بھری دشوار گزار سفر پر چلنے والے مسافر انسان کو کوئی پاگل بے وقوف کوئی جاہل کوئی گمراہ ہی کہے گا، میری رائے کے مطابق پاگل پن، جاہلیت، مست، گمرائیت کی آخری حد بھی ہو لیکن موت قبول کرنا گوارہ نہیں ہوتا، گلی شہروں میں گھومنے پھرنے والے گالم گلوچ کرنے والے پاگل بھی موت سے ڈرتے ہیں، جتنا بھی کوئی اگل ہو آگ یا پانی میں کھودنا گوارا نہیں کرتا پھر یہ پاگل کون ہیں جو اپنے پاگل پن کی وجہ سے موت کو آغوش میں لینا اپنے لیے فخر محسوس کرتے ہیں پھر یہ تو پاگل عاشق ہوتے ہیں عشق یعنی گھر کا عشق نہیں پیسے کا عشق نہیں گھر والوں کا عشق نہیں، سیر و تفریح کا عشق نہیں، ماں باپ خاندان والوں کا عشق نہیں ،نوکری روزگار کمائی کا عشق نہیں بلکہ وطن کا عشق۔

میں اپنے قلم کی نوک سے مادر وطن کے ایک سچے عاشق کی زندگی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے میں اپنے آپ سے زندگی میں بہت قریب سے پایا تھا وہ عاشق وہ بہادر و غیرت مند اور کون ہوسکتا۔ نوشکی کی گلیوں میں ایک ایسے بچے نے جنم لیا جس کے فیصلوں اور مستقبل کے حوالے سے نوشکی بھی بے خبر تھا جب اس بچے کا جنم ہوا تو نا جانے باپ نے کیا سوچ کر حق نواز نام رکھا ہوگا جب لڑکپن میں داخل ہوا یہ دور کسی بچے کے کھیلنے کے دن ہوتے ہیں لیکن تم تو عام بچوں سے ذرا ہٹ کے تھے، تمہارے عمر کے بچے نوشکی کی گلیوں میں فٹبال کرکٹ کھیلتے ہیں اور تم شہید فدا، شہید حمید کے تصاویر کو سینے سے لگا کر سوتے جب شہید نواب اکبر خان بگٹی کی شہادت کی خبر ہر طرف پھیلی تو باقی بلوچوں کی طرح تم بھی اپنے جذبات کو قابو نہ کر سکے اور گھر سے نکل کر اپنی

بساط کے مطابق دشمن کو نقصان دینے لگے۔ لوگ تمہیں دیکھ کر کہتے کہ تم بچے ہو گھر جاؤ لیکن ان کی باتوں کو ان سنی کر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ اس کے بعد بی ایس او (آزاد) میں شمولیت اختیار کی تو دن رات تنظیمی کاموں میں ایک کرتے تھے ہر کال پر حاضر تھے جب دشمن نے تمہیں مسلسل کام کرتے دیکھا تمہاری مخلصی کو بلوچ قوم کے ساتھ دیکھ کر تم پہ جھوٹے قتل کا مقدمہ کر ڈالا اس مقدمے سے بھی بور جان نہیں گھبرایا بلکہ اپنے ارادے کو مزید مضبوط کی اور بی ایل اے میں شمولیت اختیار کی اور دشمن کے خلاف ہتھیار اٹھایا۔ تمہاری بہادری کا دشمن کو اچھی طرح اندازہ تھا اس کے بعد نوشکی میں جتنے بھی تنظیمی کام ہوئیں ان کے اکثر ایف آئی آر تمہارے نام درج ہے میرے دوست بلوچ سرزمین بانجھ تو نہیں لیکن تمہارے بعد نوشکی میں بی ایس او کو تمہاری طرح کا زونل صدر اور بی ایل اے کو بہادر سرمچار نہیں ملا۔

سنگت تم نے زندگی کو اچھی طرح دیکھا تک نہیں تھا کہ وطن نے قربانی کی آواز دی اور تم بے دھڑک مادر وطن کی آواز پر لبیک کہہ کر امر ہو گئے، تم میں ذاتی غرض نہیں تھا زندہ رہنے کا لالچ نہ تھا، اپنے دشمن کو آرام کرتے ہوئے دیکھتے تو پریشان ہوتے حکمت عملی بنا کر دشمن پر حملہ کرتے تو تم خود ہر حملے میں پہلے صف میں ہوتے۔ بولان ہو یا قلات پارود میں یا نوشکی، جہاں بھی دوست آپ کو بھیجتے آپ کامیاب ہو کر لوٹتے تم تو بنے تھے دشمن کو برباد کرنے کے لئے۔

حق نواز جان 19 فروری کو بھی پہلے مورچے میں تھا بزدل دشمن بھیس بدل کر اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن حق نواز جان نے اسے ناکام بنا دیا، دوستوں کی حفاظت کی اور خود قربان ہو گیا بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو بے غرض ہو کر بغیر کسی لالچ کے جیتے ہیں اور وہی اس راستے میں کامیاب ہوتے ہیں، کامیاب بھی حق نواز، جئیند، امیر، گزین اور شیرا جیسے سنگت ہوتے ہیں ایسے تو نام کے بہت سے آئیں، کسی نے کہا کہ میں فدا ہوں لیکن فدا ہین نہ بن سکا، کسی نے کہا میں زبیر ہوں لیکن پھلین زبیر نہ بن سکا کسی نے کہا میں پھلین ہوں لیکن وطن پر قربان نہ ہو سکا، کسی نے کہا کہ میں بابو ہوں لیکن وفا نہ کر سکا، حق نواز جان تمہارے بعد بہت سے آئے، گئے لیکن ان میں

سے حق نواز کوئی نہ بن سکا آج بھی آنکھیں نوشکی کے راستوں پر لگے ہیں کہ شاہد کوئی حق نواز آئے گا اور امید ہے کہ ایک نہ ایک دن وہی حق نواز وہی سوچ وہی کام کا جنون وہی مادر وطن سے عشق کا جنون لیکر ضرور آئے گا۔

آج دوست تمہیں گزرے دوسال ہوگئے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ کل کی بات ہے کہ ہم سب ایک ساتھ تھے آج جب ان راہوں سے، ان گزرگاہوں سے گزرتا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم اب بھی ساتھ ہو۔ ان پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑتا ہوں تو تمہیں ساتھ پاتا ہوں ہر لمحہ ہر پل تم یاد آتے ہو تمہاری دوستی تمہارا خلوص تمہاری بہادری آج بھی یاد ہے سنگت، تم نے تو وطن سے وفا کی اور مکمل ہوگئے۔

آج بھی یاد ہے شہید حئی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشن بیر گیر کو انجام دینے کے سلسلے میں شہید ہوگئے تو کام کے سلسلے میں شہر گئے ہوئے تھے جب تمہیں اطلاع ملی کہ حئی شہید ہوا ہے تو تم سب کام چھوڑ کر کیمپ چلے آئے اور حئی کی شہادت پر بہت افسردہ تھے اکثر سوچوں میں گم رہتے تھے حئی جان کی شہادت کے چار ماہ بعد دشمن کے ساتھ دوبدو لڑائی میں سنگت حق نواز بھی شہید ہوگیا سنگت تمہارا فکر آج بھی زندہ ہے لیکن کبھی کبھی اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے کہ مجھ جیسا کمزور انسان کم سوچ رکھنے والا شخص کم ہمت کو تم جیسا دوست ملا تھا۔

☆☆☆

شہید مقبول کے کچھ یادیں

ضیاء دلجان بلوچ

زندگی نے اِن چھ، سات سالوں کے عرصے میں کئی توڑی خوشی تو کئی بے رحم درد دیکھے، کہیں دوست بچھڑے اور کہیں جہد میں شامل ہو کر محو سفر ہوئے، بہت سے بیچ راستے میں ساتھ چھوڑ گئے اور کہیں کسی کے ساتھ اعتبار اور بے اعتباری کے ملے جلے رشتے کے ساتھ آج تک یہ سفر جاری ہے۔ بلوچستان جنگی حالت میں ہے آپ اور آپ کے دوست اس جنگ میں ایک ساتھ محو سفر ہیں اور جنگ خود ایک بے رحم عمل ہے کب اور کس وقت کونسا دوست دشمن کے ساتھ مدبیڑ میں شہید ہو جائے کسے معلوم مگر یہ ایک حقیقت ہے اور اسی کو قبول کر کے چلنا ہوگا۔ اس دوران بہت سے دوست مادر وطن پر قربان ہوئیں امیر، نثار، حق نواز، شیرا، گزین ان سب کی شہادت و جدائی نے تو جیسے پارود کی زمین کو ویران کر دیا ہر آنکھ نم، ہونٹ خاموش، ہنستے ہنستے ہمسفر جدا ہو گئے۔

ان کی جدائی نے دل کو کیا کم ضعیف کیا تھا کہ 3 فروری کو عرفان جان دو ساتھوں کے ساتھ دشمن کے منصوبوں کو ناکام بناتے ہوئے وطن عزیز پر قربان ہو گئے۔ شہید عرفان کے ساتھ شہید ہونے والے شعیب اور خالد کو بھی میں جانتا تھا، سنگت خالد سے جان پہچان کم تھی لیکن شہید مقبول عرف شعیب کے ساتھ بچپن کے دو تین سال گزارے تھے تب بس کھیل کھود ہی تھا۔ بچپن گزرنے کہ ساتھ ہم بھی وہاں سے نکل کر زندگی کے کشمکش میں لگ گئے اس درمیان کہیں سال گزرے مقبول ذہن کے کسی کونے میں بھی موجود نہیں تھا اور کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مقبول سے زندگی میں ملاقات ہوگی اور ہوتا بھی نہیں اگر کہ راستہ الگ چنا ہوا ہوتا یہ غالباً 2013 کی بات ہے، سینے میں شہید حئی (نثار) اور حق نواز کی یادوں کے ساتھ دن گزر رہے تھے، نئے آنے والے دوستوں کو لانے کچھ دوست کیمپ سے جا رہے تھے، جب وہ شام کو واپس آئے تو ان کے ساتھ دو مہمان بھی تھے ان میں سے

ایک کودیکھ کرایسا محسوس ہوا کہ کہیں تو دیکھا ہے مگر یاد کچھ بھی نہیں، ایسے موقعے پر اور خاص کر رازداری کے لیے نہ کسی کے متعلق پوچھنا ہوتا ہیں نا سوچنا مگر بار بار نظروں کے سامنے آنے کہ بعد تھوڑی دیر تک ذہن پر زور دیتا رہا تو اچانک خیال آیا کہ یہ تو ماما حسن کا بیٹا مقبول ہے، ہاں وہی تو ہیں ایک آہ بھری دل میں کہ کتنا کچھ رہ گیا، کون کہاں کھو گیا، اپنے بھائی دوست رشتہ دار تک رہ گئے اور یہ جس کے ساتھ بچپن میں چند سال گزارے تھے اب پھر سے ساتھ میں سفر شروع ہو رہا ہے۔

خیر شہید مقبول جس دوست کے ساتھ آیا تھا ایک دن میں وہ اپنا سامان لیکر چلا گیا پھر یہ سلسلہ چلتا رہا وہ دو تین مہینے کے بعد آتا اپنی حکمت عملی دوستوں کے ساتھ بیان کرتا اور سینئر دوستوں و ذمہ داروں سے اپنے لیے ٹارگٹ لیکر واپس چلا جاتا ہم اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ اور وہ اپنے مشن کے ساتھ مصروف تھا۔ وہ جب بھی آتا تو جلدی میں ہوتا کبھی اس کے ساتھ اچھی طرح بیٹھنے اور مجلس کرنے کا موقع نہیں ملا اور میں اس پر ظاہر نہیں کرسکتا تھا کہ میں تمہیں جانتا ہوں کیونکہ یہی تو ہمارے اصول ہیں۔

مقبول امیر جان کے بہت نزدیک تھا وہ اکثر ایک ساتھ بیٹھتے تھے یا امیر جان جب بھی فون پر جاتا تو مقبول سے حال احوال کرتا، ایک دن میں اور شہید امیر جان اوپر مورچے میں ڈیوٹی دے رہے تھے کہ باتوں باتوں میں شہید امیر نے مجھے کہا کہ یار زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں کہ ہم میں سے کون کب شہید ہو جائے، اگر میں اس دوران شہید ہوا تو مقبول کو ضرور سنبھالنا ہوگا۔
پھر 7 اپریل 2014 کا وہ دن بھی آیا کے امیر جان اپنے قول پر کھڑا رہ کر ہم سے دور چلا گیا، اب شہید امیر کا کہا میرے دل پے ایک بوجھ تھا رابطے سارے ختم ہو گئے تھے کئی مہینوں کے ڈھونڈنے کے بعد جب میرا رابطہ شہید مقبول سے ہوا تو اسے ملنے کا کہا، وہ چلا آیا ہم ملیں۔ جب میں نے اسے بتایا کے شہید امیر نے مجھے آپ کے لیے پیغام دیا تھا۔
پھر اس کے بعد میں اور سنگت مقبول نزدیک ہوئے۔ جب بھی مقبول سے دوستوں کو کام ہوتا تو وہ بلا کسی جھجک

پہنچ جاتا اس کے کام کرنے کی جستجو لگن حوصلہ اسے کبھی تھکنے نہیں دیتا تھا ہاں زندگی کی دوڑ میں کبھی کہیں مصروفیات بھی ہوتے تھے مگر ان ہی مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے دیئے گئے کام کو مکمل کرتا تھا تب بھی وہ اپنے کام میں مگن وطن کا مرید مجھے یقین ہے آخری وقت میں ایک لمحے کو بھی سوچا نہ ہوگا ان سب کے متعلق جنہیں اس نے بچپن سے والدہ کے انتقال کہ بعد سنبھال رکھا تھا اس آنگن کے متعلق کوئی خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ میرے بعد انکا کیا ہوگا۔

یہی ہوتا ہے جہاں تم زندگی کے ہر شئے سے عزیز اپنے مقصد اپنی جہد اپنی سرزمین کو مانتے ہو۔ یہاں تمہیں اپنے مقصد اور اس کی حفاظت کے سوا کچھ سوچنا نہیں ہوتا تب ہی اپنے سینے میں کئی راز دفنا کر شہید امیر جان نے آخری گولی کا فیصلہ کر لیا، شہید صدام (عرفان) جس نے یہ آرزو دل میں لیے کہ دُرین کو آنے والی صبح حاصل ہو، بنا اپنی بیٹی کو دیکھے زندگی کو جیت چلا، مورچہ سنبھالے حق نواز بھی کم عمری میں دیوانہ وار ہوکر دشمن پر ٹوٹ پڑا، شہید شیرا واحد کفیل اپنے گھر کا مگر سوچ ایک مکمل قوم کی ایسے اور بہت سے کردار رکھنے والے یہ لوگ ذرہ بھر بھی اپنے فیصلے سے نہ چوکے ہونگے۔ ہر سنگت دل میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ سوچتا ہوں موت سے زیادہ تکلیف دہ یہ ہوتا ہے کہ آپ زندگی سے بھی عزیز سنگت یار دوست کھودوں یہ درد تنکا تنکا لمحہ بہ لمحہ ڈستا رہتا ہے۔

کبھی کبھی سوچتا کہ سنگت مقبول نے کیسا حوصلہ پایا تھا، بچپن میں والدہ کی وفات کے بعد اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنا انہیں بڑا کرنا ان مشکل حالات میں جہاں ہر ذمہ داری تمہارے سر ہو وہاں سر پر ایک اور ذمہ داری اٹھا لینا عاشق مزاجوں کے سوا کسی کے بس میں نہیں، عاشق جو عشق کی انتہا میں ہر سِنگ راہ سے چل نکلے۔ مقبول ان عاشق مزاجوں کا ساتھی ہے، میں ان کے سفر کا راہی ہوں۔ وہ گزر کر سُرخرو ہوئیں اور ہمیں اس گھڑی کا انتظار ہے۔

☆☆☆

شہید عرفان جان

ضیاءدلجان بلوچ

ابھی اس کی داڑھی اچھی طرح نہیں آئی تھی، جب بات کرنا شروع کرتا تو بندہ اندازہ لگا تا کہ ابھی عمر میں بہت چھوٹا ہیں لیکن جب اپنے اور اپنے قبیلے کے اوپر سردار کے ظلم کے داستان سنانا شروع کرتا تو سننے والے حیران ہوتے کہ اس چھوٹی عمر میں اسے وہ سب یاد ہیں جو اس کے خاندان والوں کے ساتھ ہوا تھا، تمام طبقاتی و معاشرتی ناانصافیاں......استحصال، ظلم و جبر......

وہ اکثر کہتا کہ اگر آج مسلح تنظیمیں نہ ہوتے تو بلوچ قومی آزادی کی بات ہم تک نہیں پہنچتی اور ہم جیسے آج بھی سردار کی غلامی کرتے۔ وہ جب اپنے علاقے کے سفید ریشوں کی باتیں کرتا کہ سردار کیسے انہیں بے عزت کرتا تھا، کیسے کھڑی فصلوں کو آگ لگا دیا جاتا، کیسے بلوچ قومی تحریک کیساتھ وابستگی کی پاداش میں نوجوانوں کی مسخ شدہ لاشیں پھینکی جاتی تو اس کی آنکھوں میں سرداراور اس کے کارندوں کے لیے نفرت انتہائی زیادہ نظر آتا۔ وہ ہر وقت یہی سوچتا کہ علاقے کے سب لوگ مجبور ہو کر اپنا سب کچھ چھوڑتے ہوئے دربدری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی زمین جائیداد سب چھوڑ کر نکل چکے ہیں لیکن پھر بھی اپنے بچوں کو بلوچ کی جنگ سے دور رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر بہت کڑھتا تھا کہ یہ لوگ کیوں غلامی کو اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتا تھا اور مسلسل جہد و جہد پر یقین رکھنے والا انسان تھا وہ ہر صبح ایک نئے سوچ و عزم کیساتھ دن شروع کرنیوالا شخص تھا۔ وہ جو

سوچتا سمجھتا بلا جھجک بولتا اس لیے مجھ جیسے کہتے ''عرفان گنوگ ئسے عرفان پومفک ،عرفان ءِ دماغ اَف''

(عرفان پاگل ہے،عرفان نہیں سمجھتا ہے،عرفان کُند ذہن ہے۔) لیکن ہم جیسے جو اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے

ہیں ہم جیسے لوگ جو عرفان جیسوں کو مشورہ دیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کے سرزمین سے پاگل پن کی حد تک

عشق ایک ایسا فرزند ہی کرسکتا ہے اور جان بھی وہی دیتے ہیں جو وطن کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں......عشق میں

دماغ پیچھے رہ جاتا ہے، دل اور پاگل پن ہی عشق کی آخری حد تک سچے عاشق کو لے جاتے ہیں۔ایسے وطن

کے فرزندوں میں خوف لالچ نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی ان کی زندگی میں ناممکن لفظ ہوتا ہی نہیں، وہ یہ سوچنا

ہی نہیں چاہتے کہ ایسا کوئی کام ہے جو ناممکن ہو، وہ ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ہم جیسوں

کے لیے جو ناممکن ہوتا ہے ان کاموں کو عرفان، امیر اور نثار جیسے سنگت ممکن بناتے ہیں۔عرفان اور امیر جان

کے آخری فیصلوں کے بعد ہم جیسے عقل کے دکان سجانے والوں کو یہ سمجھنا ہوگا کہ ہم نے اپنی دکان وہاں لگائے

ہیں جہاں آنے والے ہم سے زیادہ عقل مند ہیں۔ان کے سامنے تو عقل بھی حیران ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو

مرنے کے لیے دوڑے چلے آتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہیں محوِ تماشہ لبِ بام ابھی

اور ہم جیسے ان کو سمجھاتے تھے کہ تم کچھ نہیں جانتے، دراصل اس وقت ارد گرد کی چیزیں ہم پر ہنس رہے ہوتے

ہیں کہ یہ الفاظ ان کو کیا گھیرینگے جو اپنا آخری فیصلہ اپنی زندگی میں ہی کر چکے ہوتے ہیں۔عرفان بھی اپنا فیصلہ

کر چکا تھا اور اس نے آخری لمحات میں اہم فیصلہ کرکے امیر جان کے کاروان میں اپنا نام لکھ دیا بقول غالیاں

یوسف کے امیر جان نے جاتے جاتے اپنے دوستوں کو ایک نئی راہ دکھایا اور آج عرفان جان نے وہ سچ کر دکھایا، عرفان جان کے آخری فیصلے نے مجھ جیسے عقل کے دکاندار کے ساتھ ساتھ دشمن کو بھی حیران کر دیا کہ ہم جسے زندگی میں کوئی اہمیت نہیں دیتے حقیقت میں وہ ہم سے بہت اعلیٰ ہوتے ہیں، ہمیں ہماری انا ان کے قریب جانے نہیں دیتا ہے۔

عرفان جان آپ نے جاتے جاتے ہمیں یہ بتا دیا کے آپ جس جگہ سے تعلق رکھتے ہو، آپ کا تعلق جس قبیلے سے ہو اور آپ کے قبیلے اور آپ کے بارے میں جو رائے رکھا جاتا ہے یا ہم جیسے نہام نہاد عقل کے دکاندار آپ کے بارے میں جس قسم کا بھی منفی سوچ رکھتے ہیں ان سب کا جواب دینے کے لیے امیر جان اور عرفان جان کا اپنے لیے رکھنے والی آخری گولیاں ہی کافی ہے جو دشمن کے منہ پر طمانچہ ثابت ہونے کے ساتھ غلامی کی نیند سونے والے بدبخت نوجوانوں کو بیدار کرتے ہیں۔

☆☆☆

شہید سنگر یار جاوید جان

ضیاء دلجان بلوچ
30 مئی 2016

2010 ایک انجانا سا چہرہ، معلوم نہیں سنگت امیر جان کہاں سے ڈھونڈ کے لایا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا سونے کی پہچان سونار کو ہوتی ہے۔ بدن پر کالے کپڑے، کاندھے پر سندھی اجرک، بھورے بال، چھوٹی آنکھیں، لمبی ناک، ابھی لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا ہوگا اور ابھی ہی اپنے قد کاٹ سے بڑی ذمہ داری لے کر مادر وطن کی آجوئی کی راہ میں نکل پڑا۔

ٹریننگ شروع کی تو اس دوران سب میں گھل مل گیا۔ ابھی ایک ہفتہ مشکل سے گزرا ہوگا کہ ہر محفل میں ہنستے ہنساتے شیخ (جاوید) سنگت نظر آنے لگا۔ بہت کم لوگوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ کم وقت میں اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھ کر اس میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور آپ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ انسان کئی سالوں سے ہمارے درمیان موجود ہے۔ شیخ بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ جو بہت کم وقت میں سب کے ساتھ گھل مل گیا۔ اور کام پر لگ گیا۔ اس نے ٹریننگ کے دوران ہی یہاں رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے اور کام کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

ٹرننگ مکمل کرنے کہ بعد خضدار میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں لگ گیا۔ ہر وقت دوستوں کے شانہ بشانہ کھڑا رہا۔ ہر کام میں خود کا حصہ ڈالتا رہا۔ مشکل و مصیبت ہر وقت اپنے مشن کو مکمل کرنے کی تاک میں لگا رہتا۔ جس طرح دشمن نے اپنے چال بدلے تھے ان کہ درمیان رہ کر شیخ اور اس کے سنگت اپنی حکمت عملی کو مضبوط بنا کر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا، مشکلیں بڑھتی گئی۔ پھر وہ دن آ پہنچا جب شیخ کو شہر چھوڑ کر پہاڑوں کا رخ کرنا پڑا۔ شہید سنگت امیر کے بلانے پر شیخ دوستوں کے فیصلے کو قبول کر کے سخت دشوار پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔

بعد میں آیا، دیکھا سوچا سمجھا، سب کام کر کے بہت آگے کی صفوں میں نظر آنے لگا۔ ہر کام میں پیش پیش رہنے والا کبھی تھکن کا شکار نہیں ہوا۔
شیخ گشت پے جانا ہے۔
شیخ موٹر سائیکلوں کو بنانا ہے۔
شیخ دوست کو لانا لیجانا ہے۔
شیخ قلات میں کام کی ضرورت ہے۔
شیخ حب چوکی میں تیری ضرورت ہے۔
شیخ سوراب بھی آپ کو جانا ہے۔
ہر وقت تیار رہتا۔ قلات کے انجان شہر میں خود جا کر کمان سنبھالنا، دوستوں کو سنبھالنا، کام کرنا، راتوں کو سفر کر کے سامان لیجانا، ہر موقع پر دوستوں سے مشورہ کرنا، یہاں کچھ وقت انتظار کرنا حکمت عملی کے تحت کام روکنا ہوتا تو حب چلے جاتے۔ وہاں اپنی جہد کو جاری رکھا۔

کبھی گھر جانے کی خواہش تک نہ کی کہ کہیں دشمن کی نظر میں نہ آ جاؤں۔ بس سفر میں زندگی گزارتا رہا۔ سنگت شیخ نے زندگی ہی اسی سفر کو بنایا تھا۔ تب ہی تو کبھی افسردہ نہیں دیکھا گیا، کبھی شکایت نہیں کی۔ بس شرارت کرتے مسکراتے مذاق کرتے دوستوں کی دیوان میں دکھائی دیتے رہے۔

جاوید تم کچھ کہے بنا کسی عذر کے ہر کام میں مگن رہے۔ کبھی تو انکار کرتے کبھی تو کہتے تھک گیا ہوں کبھی تو کہتے

کے مجھ سے نہیں ہوسکتا تو آج تمھارے جانے کا اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ یہ سوچتا کہ دوست تھا کچھ کام کیا کچھ نہیں، آیا اور چلا گیا۔مگر تم میں ایسی ایک بھی کمزوری نہیں کہ میں اپنے آپ کو تسلی دے سکوں۔کم سے کم کسی جنگی معاذ پر جانے کے لیے تم اپنے ایک دو قدم پیچھے اٹھاتے کہ مجھے جانا نہیں چاہیے، وہ بھی تم نے نہیں کیا۔

ہڑدہ خول ہو یا منجرو لجے ہو یا سنگر کی ذمہ داریاں، قلات کی سرداراتیں ہو یا حب کی جھلسا دینے والی گرمی، 7 اپریل کی ہیلی بور خونی آپریشن ہو یا 16 فروی کے آپریشن، کبھی کسی موقع پر تم ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ پھر آج کیوں تمہارے جانے پر نہ رو دوں۔آج تمہارے جانے پر کیوں قلات افسردہ نہ ہو۔آج تمہارے جدا ہونے پر چنال وال آنسو کیوں نہ بہادے۔اتنی جلدی جانا تھا پھر اتنا اچھا کیونکر بنے۔کہ ہر ایک کو تمہاری جدائی کا غم سہنا پڑے۔کچھ لمحے تو رک جاتے ابھی تو بہت کام تھا۔ابھی تو آئے تھے۔اجرک کاندھوں پر مسکرائے اور ابھی چل دیئے اسے بیرک بنا کے۔ابھی تو قلات تمہاری راہ تک رہا تھا۔ابھی تو حب میں دشمن طاقت کے گھمنڈ میں ہے۔ابھی تو خضدار تمہاری واپسی کا منتظر ہے۔شیخ ابھی تجھے نہیں جانا تھا، ابھی تو عرفان چلا گیا تھا۔شعیب بھی ساتھ تھا۔خالد بھی چلا گیا۔

شیخ تم زندہ ہوتے تو اور مشکلیں اٹھاتے اور سختیاں دیکھتے۔اس کم عمری میں تم ہار نہیں مانتے۔ ہر لمحہ امتحان سے گرزرنے کا لمحہ ہوتا، خواری کاٹتے۔سفر میں پیاس برداشت کرتے، سنگر پر رات رات پہرے دیتے۔مگر تم نے خود کو ثابت کر ہی دیا۔تم کھڑے تھے سب کے ساتھ کھڑے رہے۔ ہراول دستے میں اس آخری کالی رات تک جب درد کی اچانک شدت اور علاج کی کمی نے آپ کو ہم سے جدا نہیں کیا۔

تم ہر مشکل سے گزر کر وطن پر قربان ہو چلے۔جس راہ کا چناؤ تم نے جس ایمانداری سے کیا تھا اسکی گواہی تمارے عمل کا ہر پہلو بیان کر رہا ہے کہ تم نے آخری سانس تک خود کو ثابت کر کے تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ ہمیشہ امر ہو گئے۔

شیخ تمہیں معلوم ہے۔ ابھی تو سُو رجائی کا تیر اسنگر اداس ہے۔ اسے پتہ چلا ہے کہ تم اس سے دور چلے گئے ہو۔ اب وہ اپنے قریب سے راہ گزرتے بہت سو کو دیکھے گا۔ لیکن جس کی وجہ سے سور جائی کی اس چوٹی کو سنگر نام ملا اب وہ سنگر اپنے سنگر یار کو دیکھ نہیں سکھے گا۔ اب اسے اگر دیکھنا ہے اپنے سنگر یار کو تو وہ خود چلا آئے۔ سنگر یار آج سنگت امیر کے پہلو میں آسودہ خاک سو رہا ہے اسی پارود کے پہاڑوں میں جنہیں اس نے اپنے گھر کے بعد اپنا مسکن بنا رکھا تھا، جن میں سختی سوری، بھوک، بیماری، خواری، ہنسی خوشی، دکھ درد سب کچھ اپنے قوم کی خاطر برداشت کر کے انہیں اپنے سینے میں خود سمیت پارود کے پہاڑوں میں دفنا کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گمنامی کی زندگی سے سرخرو ہو کر نکلا۔ پہاڑوں کو بھی رشک آتا ہوگا ایسے جوانوں کو اپنے کوک میں پالتے ہوئے جو اپنے قد اپنی بساط سے بڑھ کر درد اتنے چھوٹے سینے میں کیسے پال کر کبھی اُف تک نہیں کرتے۔ میرا سنگر یار میرا جاوید میرا شیخ اس عمر میں اتنے کم سمے میں کتنا کچھ کر گزرا کتنا کچھ بدل کر چلا گیا۔ جس کے ساتھ آیا تھا اسی کہ پہلو میں ہمیشہ ہمیشہ کہ لیے جا سولیا۔

☆☆☆

شہید مختیار بلوچ

ضیاء دلجان بلوچ

بلوچ قومی تحریک اپنے عروج اور زوال کے ساتھ کئی سالوں سے جاری ہے کبھی دشمن کی طاقت نے تو کبھی اپنوں کی بے ضمیری نے بلوچ قوم کو تکلیف ومسائل سے دوچار کیا ہے لیکن حقائق یہی ہیں کہ مضبوط کردار مضبوط نظریات کبھی بھی کسی بابت واقعات اور ضرورتوں کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ بلوچ قومی تحریک میں بھی تو یہی اصل حقائق ہیں جس میں لوگوں نے آزادی و بلوچ قومی تشخص کے لیے جان کا نذرانہ دیا ہے وہ کسی بھی وقت حالات کے محتاج نہیں ہے وہ سوچوں میں، تاریخ میں، نظریات میں اور کرداروں میں زندہ ہیں۔

دنیا کے جس خطے میں ہم رہتے ہیں یہاں ہر روز ایک نیا واقعہ رونما ہوتا ہے ہر نئے دن کے ساتھ حالات بدلتے ہیں، حالت جنگ میں بہت سی چیزیں آپ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی جنگ جس تیزی سے سخت سے سخت ہوتی ہے بہت سے اپنے بچھڑ جاتے ہیں کچھ دوست شہید ہوتے ہیں کچھ تھک جاتے ہیں اور بہت سے رستے بدلنے والے یا تھک جانے والے تو یاد بھی نہیں آتے ، ہاں یاد آتے ہیں تو وہ دوست جو شہید ہوئے ہیں یا وہ جو زندانوں میں بند ہیں، وطن سے وفا کرنے والوں میں ایک کردار بلوچ سرمچار شہید مختار بلوچ کا ہے جس کے سامنے شخصیات، حالات، اختلافات اور لالچ نے روڑے ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ان تمام چیزوں سے اپنا دامن بچا کر جدوجہد کرتا رہا اور تاریخ کا حصہ بن گیا اور آج مختیار بلوچ کسی کی صفت وثنا کا محتاج نہیں بلکہ شاید زندگی گزارنے والے دوسرے لوگ اس کی یادوں کے محتاج ہے۔

شہید مختیار سے میری پہلی ملاقات بی ایم سی ہاسٹل میں ہوا۔ میں اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا وہاں شہید بھی

موجود تھا شہید کے ساتھ کم دنوں اور کم وقتوں کی جان پہچان نے ہمیں سنگتی کے بندھن میں باندھا، شہید مختیار بی ایس او آزاد کے کاموں میں اکثر مصروف رہتا تھا، دن ہو یا رات، سردی گرمی اور دشمن کی سختیاں لیکن وہ ان سب کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ ان دوستوں سے خفا رہتا تھا جو تنظیمی کاموں سے جان بچاتے اکثر انہیں تنقید کا نشانہ بناتے۔ کوئٹہ میں کئی مرتبہ گرفتار بھی ہوئے لیکن رہائی کے بعد پھر اپنے کاموں میں لگ جاتا تھا، بلوچ لاپتہ افراد کے لیے لگائے گئے احتجاجی کیمپ میں ماما قدیر کے پاس جاتا اور دوسرے دوستوں کو کہتا کہ ماما اکیلا ہوتا ہے کبھی کبھار سنگت ماما کے پاس جایا کریں ماما کی حوصلہ افزائی کریں۔

حالات سخت سے سخت ہور ہے تھے لیکن مختیار جان ان سخت حالات میں بھی اپنے کام بڑی دلیری و جوان مردی سے کرر ہا تھا۔ پھر 2010 کا وہ مخصوص سال بھی آیا جس میں بہت سے سنگت بے گواہ (اغواء) ہوئے بہت سے شہید ہوئے، حالات کی سختی دیکھ کر سب دوست کوئٹہ سے نکل گئے، کوئٹہ سے نکلنے کے بعد پھر کبھی میرا شہید سے حال احوال نہ ہو سکا۔ ایک دوسرے سے رابطہ ختم ہو گیا پھر 2011 میں بولان کیمپ میں مکران سے ایک سنگت آیا اس سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مختیار آج کل مکران کے محاذ پر دشمن سے نبرد آزما ہے یہ جان کر دل کو سکون ملا کہ مختیار جان باقی عام دوستوں کی طرح بزدل نہیں نکلا کیونکہ جب عام زندگی تھی بہت سے لوگ قریب تھے اور اپنے آپ کو بہترین دوست سمجھتے لیکن جیسے حالات نے کروٹ بدلی تو ان عام دوستوں نے بھی منہ موڑ لیا لیکن مختیار جیسے دوستوں کا جب پتہ چلا کہ وہ آج بھی محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں تو ہمت اور بڑھ جاتا۔

2010 سے بچھڑے دوست کی خبر جب 2015 میں مکران کے سنگت بوہیر جان نے دیا کہ مختیار آج ہمارے پاس ہے اور وہ قلات تم سنگتوں کی طرف آنا چاہتا ہے تو دل بہت خوش ہوا کہ پرانے دوست پرانی جان پہچان مختیار سے ملاقات ہوگی۔ قلات آنے سے دو دن پہلے اور پانچ سال حال حوال نہ ہونے کے بعد جب مختیار جان سے فون پر رابطہ ہوا، اس نے اپنے قریبی کچھ دوستوں کا پوچھا کہ وہ کہاں ہیں، مختیار جان نے پوچھا فدا کہاں ہے باقی دوست کیسے ہیں، ٹھیک ہیں؟

میں نے کہا یار سب بتا دونگا سب سے ملواؤنگا تم بس جلدی آجاؤ۔مختیار نے کہا ٹھیک ہے دوست انشاء اللہ دو تین دن میں پہنچ جاؤنگا۔فون پر خدا حافظ کہہ کر جب میں واپس ہوا تو سارا راستہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ یہاں آئے گا اور دوستوں کا پوچھے گا تو میں کیا جواب دونگا کہ جو دوست اپنے آپ کو تمہارا شیر کہتے تھے وہ زیر ہو گئے ہیں۔

دو دن بعد جب پھر رابطے پر آیا تو کسی دوست نے کہا خاران راہ چیل کے مقام پر کچھ لوگوں کا فورس کے ساتھ جھڑپ چل رہا ہے،ادھر اُدھر سے دوستوں کے ساتھ حال حوال کیا کہ معلوم کروں کون لوگ ہیں۔ جب ایک دوست سے رابطہ ہوا دوست نے کہا کہ مختیار جان اور اس کے دوستوں کا جھڑپ ہوا ہے،فورس کے کچھ لوگ مارے گئے ہیں اور مختیار جان بھی شہید ہوا ہے، باقی دوست نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں،دوسرے دن جب مختیار جان کی لاش کی تصویر دیکھی تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑے کے دوست تم نے دو دن بھی انتظار نہیں کیا......!

☆☆☆

شہید وحید جان محترم

ضیاء دلجان بلوچ
23 مئی, 2017

زندگی چند لمحوں کی ہوتی ہے اوران چند لمحوں کو بہتر ڈھنگ سے گزارنے کا فن کچھ لوگوں کو آتا ہے۔ دنیا میں عظیم لوگ وہی ہوتے ہیں جو زندگی کو عظیم مقاصد کے تابع کر کے آخری مشکل حالت میں بھی مسکرا کے وطن پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ بلوچستان کے ہر شہراور ہر گاؤں میں ایسے سپوتوں نے جنم لیےاور وطن پر قربان ہوئے جنہوں نے ان چند لمحوں کو غنیمت جانا اور میدان کارزار میں اترے، دل بھر کے جیئے، زندگی بھر کے لیے جاوداں ہوئیں۔

آج میں جس عظیم سنگت کا ذکر کرنے جارہا ہوں وہ بھی اسی سرزمین کا فرزند رہااور مستونگ کے تنگ وتاریک گلیوں میں جنم لیا جہاں اس سے پہلے بھی اسی سرزمین پہ کئی سپوتوں نے جنم لیا تھا جو وطن پر باری باری قربان ہوتے رہے۔ ہمارے سنگت وحید نے بھی ان قربانیوں میں اپنا حصہ ڈال کر مستونگ کے شہیدوں کے باب میں اضافہ کر دیا۔ سنگت محترم سے دو ہزار گیارہ میں بولان کیمپ میں پہلی ملاقات ہوئی جب وہ شہید رشید کے ساتھ آیا تھا ہم دونوں مختلف محاذوں پر شہید خلیل کی شاگردی میں رہے تھے اس لیے جلد ہی گھل مل گئے چند مہینے ساتھ گزارنے کے بعد شہید وحید جان پھر سے نئی حکمت عملی کے ساتھ شہر میں تنظیم کے کاموں میں مصروف رہا اور دشمن پر وار کرتا رہا زندگی چلتی رہی، دوست دشمن کے ساتھ مختلف محاذوں پر لڑتے رہے قربان ہوتے رہے، ہم اور وحید جان اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے، یہ اگست کا مہینہ تھا جب وحید جان سنگت گہرام کے ساتھ شور کے کیمپ آئے اور کچھ دن رہنے کے بعد پھر بولان روانہ ہوئے۔ ہر ایک اپنے محاذ پر مصروف رہا، دن

گزرتے گئے سالوں میں بدلتے گئے، کئی دوست شہید ہوئے اور کئی دوست دشمن کے چالوں میں آکر سرنڈر کرتے رہے، دو ہزار سترہ کو جب میں کسی کام کے سلسلے میں مستونگ پہنچا تو کچھ دن بعد شہید محترم اپنی چھٹیاں گزار کر ہمارے پاس پہنچ گیا تاکہ آگے اپنے کیمپ بولان جائے۔

ان چند سالوں میں ہم اکثر دوستوں کا مزاج بدل چکا تھا شاید حالات کی وجہ سے رویوں میں سختی آئی تھی، ہنسی مذاق کی جگہ صرف ہلکی سی مسکراہٹ سے کام چلا لیتے تھے لیکن سنگت محترم وہی دو ہزار گیارہ کا ہنس مکھ بندہ تھا، وہی باتیں وہی ہنسی مذاق، مجلس کی جان تھی۔ نئے آنے والے لوگوں کو ایسا لگتا کہ محترم پر کوئی غم ہی نہیں۔ غم تو محترم کے دل میں بہت سے تھے، خلیل کی شہادت، رشید جان کی جدائی اور کئی قریبی دوستوں کی بیگواہی کے غم کے ساتھ ساتھ بہت سے قریبی ساتھیوں کی بے وفائی کے دکھ بھی دل میں سہتا رہا لیکن وہ ہماری طرح کمزور نہ تھا کہ اس کے چہرے پر یہ سب درد و الم دوسروں کو اس کی اندرونی کیفیت کا تاثر دیتے، اسے غم چھپانے اور مسکرا کر زندگی گزارنے کا فن اچھی طرح آتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے سے پتہ چلتا کہ اتنے مشکل حالات کے بعد محترم میں کتنی پختگی آئی ہے۔ شہر سے لیکر شور بولان سے لیکر کوہستان کے پہاڑوں تک میرے محترم کے قدموں کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ وہ اب پہلے سے زیادہ بہت کچھ جانتا تھا اس کے پاس اب ایک وسیع تجربہ تھا جو مختلف کیمپوں میں رہنے اور مختلف دوستوں کے ساتھ ملنے سے اسے حاصل ہوا تھا۔ شہید خلیل نے اسے انگلی پکڑ کے چلنا سکھایا تھا تو سنگت گہرام کی محنت سے اب وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا۔ کئی سال بعد ملنے پر میں چاہتا کے وہ آگے نہ جائے بلکہ یہیں ہمارے پاس رہے لیکن اس کی ذمہ داریاں اب پہلے سے زیادہ تھیں۔ اس لیے اسے بولان کیمپ جانا تھا۔ آماچ کے خوبصورت پہاڑوں وادیوں سے ہوتے ہوئے جب ہم بولان کے بل کھاتے ہوئے دل لبھانے والے ندیوں میں پہنچے۔ یہ وہی خوش قسمت جگہ ہے جہاں وطن کے فرزندوں شہید مجید، شہید سگار اور شہید حمید شاہین نے انہی چشموں سے اپنی پیاس بجھائی تھی اور جن کو ہم جیسوں کی آنکھیں دیکھنے کے لیے پیاسے تھے اور پیاسے ہی رہے۔ کچھ دن یہاں پر رہے اور چشموں کی چر چراتی پانی سے کھیلتے اور پیاس بجھاتے رہے۔۔ اس کے بعد وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا اور ہم واپس

ہوئیں، جاتے جاتے اپنی ریڈو مجھے تھما دیا اور کہا یہ لو سنگت جب اگلی دفع واپس ملینگے تو پھر لے لونگا۔ میں نے بھی مسکرا کر سر ہلا دیا اور پھر ملنے کا کہہ کر مڑا لیکن کیا پتہ تھا کہ بہت سے شہید دوستوں کی آخری ملاقات کی طرح یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ شہید سنگت امتیاز بھی جب بولان کی طرف محوسفر ہوا تو پھر ملنے کا کہا مگر بولان کے سرمئی پہاڑوں میں وطن کی مٹی کو اوڑ لیا، شہید جاوید نے قلات سے خدا حافظ کہتے ہوئے پھر ملنے کا کہا لیکن واپسی سے پہلے شور کے دامن میں آسودہ خاک ہوا، شہید حیو نے مسکرا کر پھر آنے کا کہا لیکن سوراب کی کوکھ میں ہمیشہ کے لیے سو گیا، شہید شیر اساتھ لینے آیا تھا لیکن پھر ہمیشہ کے لیے اکیلا دور چلا گیا، شہید مختار جان سالوں کے بعد ملنے آرہا تھا خاران کے ریگستان میں دشمن کے ساتھ مڈبھیڑ میں ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا، شہید وحید جان نے بھی ماما مہندو، شہید نصیب جان اور دلوش جان کی طرح بولان کے دامن کو اپنے خون سے رنگ دیا اور دشمن سے آخری دم آخری گولی تک لڑتا رہا اور قربان ہوکر بولان کو ایک مرتبہ پھر دشمن کے سامنے سرخرو کر دیا اور مستونگ کے نرمزاروں کے صفوں میں شامل ہوگیا۔

ہم انہیں اپنا ہیرو مانتے ہیں جو وطن کا سچا عاشق بن کر وطن کے بھاسیوں کے لیے آرام وسکون کا ساماں پیدا کرنے گھر سے چل پڑتے ہیں، نہ ڈرتے ہیں نہ تھکتے ہیں نہ ہی گھبراتے ہیں۔ گھر انہیں بھی یاد آتا ہے، بچپن کے دوست اپنے علاقے کی یادیں انہیں بھی ستاتی ہیں لیکن پھر بھی وہ آزادی جیسی نعمت کو گلے لگانے کیلئے اپنا سفر آگے کی طرف جاری رکھتے ہوئے ایک دن اپنے اپنے گھروں سے علاقے سے دور وطن کے کسی کونے میں آسودہ خاک ہوکر مادر وطن کیلئے اپنی محبت کا ثبوت دے کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امر ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

شہید نثار جان عرف میرل

ضیاء دلجان بلوچ

27اکتوبر2017

پُل بس شما ھوسلہ بہ دارِات انشاءاللہ اے کار بہ اَنت-

بس سنگتانی ھیال ءَ بہ کن اِت

پارود کی سرد یادوں سے مستونگ کی گلیوں تک شہید نثار میرل کے ساتھ گزرا زندگی کے حسین لمحات پوری شدت سے نظروں خیالوں میں گھومتے رہے، جب اطلاع ملی کہ پھُل میرل ہم سے جدا ہو گیا۔

اک امید، اک بھروسہ، اک ساتھی جو ہمیشہ لبوں پے مسکان سجائے ہر سنگت سے محو گفتگو رہتا، جسے کبھی کسی مسئلے میں الجھا ہوا نہ پایا، مجھ سمیت کہیں دوست بھکے الجھے مسائل میں تیرتے رہے مگر نثار ان میں سے تھا جو بہاؤ کے رخ کو بدلنے اور اسے یک مشت ایک خوبصورت موڑ پر لانے کا منتظر تھا۔

کچھ لوگ اپنی ذمہ اریوں سے زیادہ کسی اور چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتے، انہیں زندگی بس اس لمحے تک چاہیے ہوتا ہے جہاں وہ اپنے ذمہ کا کام مکمل کر سکے اسکے بعد وہ ہنسی خوشی اپنی موت کو گلے لگاتے ہیں۔

شہید درویش جس نے اپنے کام، اپنے مقصد اپنے مشن کی خاطر ہنسی خوشی اپنی جان دے دی۔ میرا میرل نثار کئی بار موت کو چکما دیکر اسی مقصد کی خاطر زندگی کو نظریں دکھا کر جی رہا تھا، رات بھر دشمن کے حملے میں گزار کر صبح انکے گھیرے سے نکلنے کا ہنر، بہادری۔ کچھ اور کرنے کی خواہش ہی تھی کہ پھر وہ نہ گھبرایا نہ بہک گیا بس اپنے

مقصد سے جڑا رہا کہ جو دوریاں جو بے بھروسی جو غلطیاں ہم سے ہوئی ہیں انکا حل انکا سلجھاؤ ہمارے ذمہ ہیں، وہ یہی کرنے کے لیے موت کو مات دیتا رہا اب جب اس نے اپنے مشن کو مکمل ہوتے دیکھا تو موت کو بخوشی گلے لگا لیا۔ ایسے لوگ، ایسے لوگوں کی زندگیاں تاریخ ہمیشہ زندہ رکھتی ہے جن کی زندگی اجتماعی مقصد کی خاطر وقف ہوئی ہو، یہی میرے میرل نثار کا شیوہ تھا۔

اس کی ایک آواز جب بھی کانوں میں پڑھتی تو حوصلہ بڑھا دیتا۔ ایک دوست جسے دیکھ کر بس دیکھتا ہی رہنا، ایک فکر انگیز مقرر پُر مسرور گفتگو کرنے والا شخص نثار جان۔ ہر ایک اچھائی اس شخص میں موجود تھی۔ اتحاد سے لیکر اختلاف تک پھر اتحاد کی پہلی اینٹ رکھنے کا سہرا نثار جان جیسے دوست کو ہی جاتا ہے جس نے بلوچ تحریک کو ایک نئی موڑ دی، ہم جیسے کند ذہن تنگ نظر لوگوں کو ایک بہترین سوچ دی ہم تو اپنے پیروں مرشدوں سے آگے دیکھ نہیں سکتے تھے ہم اپنے پیروں کے قدموں میں ایسے سجدہ ریز تھے کہ ساری کائنات کے ہست نیست اپنے ہی پیروں کو سمجھتے لیکن ہم میں وہ ایک ایسا تھا جو ان پیروں مرشدوں سے بھی بہت آگے کی سوچ رکھتا تھا۔ جس کی نظر میں منزل کے سوا کچھ نہ تھا، حقیقت پسندی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس نے ہمیشہ سے یہی کوشش کی تھی کہ منزل کا پڑاؤ مشترکہ جہد میں ہی ہے، یہ شخ بانٹ نہ یہاں مفید ہوگا نہ وہاں۔

کچھ لوگ صرف باتوں تک محدود ہوتے ہیں مگر میرل جیسا سنگت اس میں عملی طور پر شامل تھا بلکہ اس کی بدولت اور بہت سارے دوست اس عمل کا حصہ بن گئے۔

میرل مکران سے مشکے، مشکے سے پارود قلات اور مستونگ تک ہر تنظیم، ہر سنگت سے جب بھی محو گفتگو ہوتا کسی کو یہ تاثر تک نہ ہوتا کہ کچھ اختلاف یا تلخی اس کے دل میں ہمارے متعلق ہے، وہ کبھی ایسے بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا مگر مستقبل و مشترکہ کاموں کے متعلق خوبصورت و مہربان الفاظوں سے ہمیشہ درس دیتا رہتا تھا۔

ایسے دوستوں کی قربانی انکا مقصد ان کے بہتے لہو نے ہمیشہ تحریک کو بھکنے سے روکے رکھا ہے، ایسے دوستوں کی بدولت ہی دشمن کے حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔ ایسے دوست ہی ہوتے ہیں جن کی زندگی میں ہی ان کی اہمیت، رتبہ، سوچ انکے کام سے واضح ہوتا ہے۔

سنگت آپ نے اپنا مقصد اپنا مشن مکمل کرلیا ہے اب ان سمیت مجھ جیسوں کی ذمہ داری ہے کہ آپ کے بہتے لہو کو کس جانب دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس جانب جس کی خاطر محنت، کوشش ہمیشہ آپ کا شیوا تھا یا اس جانب جہاں خود پسندی، خودغرضی، دوریاں اور بشخ بانٹ کے سوا کچھ نہیں۔

امید اور ایمان ہے میرا کہ وہ جو آپ نے شروع کیا تھا اسکے بعد کا سفر منزل جہد آزادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

مغرور آطُوبے

ضیاء دلجان بلوچ

بھلو پند ئسے آن گڈ ننگ کنا ہم باریسو، جاٹہ وتو فک نابڈ آن کو پہ آک کناریش مسوسر۔ بدن ہم کُٹہ کُٹہ مس، نن تمادمدری ءِ ایسر کننگ کن وخاچنگ کن کو پہ غاارفوک پُشتی ءِ تالان کریٹ۔ طوبے ہم چانڑ دہی اس، کنا وطوبے نا بھاز اُرے آن ناٹھی ئسے ۔اینو ہم طوبے تینا جولان ٹی ئس۔ خن تے ترکریٹ کہ نوا تنگان کا وٗ لے طوبے نا روشنائی ختنا تہٹی اندن لگا کہ بیوس مسوٹ ختنے چادراٹ تفیٹ ، وا ہم طوبے نا روشنائی چادراٹ ہم سلیتو ، آخر ای ہم جوزہ ٹی بسوٹ ختنا تفوکا چادر ءِ ارفیٹ خساٹ ، ہور ءِ تینا طوبے کن مریفیٹ لاڑکریسہ پاریٹ تا کہ ’’نی تینے انت سمجھسہ ، نے سماءِ کہ نی کنے دوست بفیسہ ، نے سماءِ نا روشنائی ناسوب کس نن ناتُغ آن تمک ۔نن ءِ خدا خاچنگ کن کرینے کہ بندغ جارات کے ولے نا روشنائی کن کون آ تاتغ ءِ خراب کیک۔‘‘

’طوبے ہم گوڑ ینگوک فریشان کنا ہیت آتے بنگ ۔کنا چھپ منگ تون اودشروع کرے، پارے ’’نی ہم گوڑ یفوک ء بندغ ئسے اس ، بھاز ابندغ آک ودار کیرہ کہ ای ہراتم مش ئناٹُل آن پاش کیوکہ او تینا نن نا تنیاءِ کنتون گدریفر ، مسافر آک کسراروک مریرہ کہ ای ہراتم روشنا مریو کہ اونن اٹ سفر کننگ کیر، عاشق آک تو تینا محبوب نادروشم ءِ کنے ٹی پٹیرہ ،شاعر آک کنے خنر تو اوفتا بے پورہ غاک شاعریک پورہ مریرہ۔ جہان ناپین کئ ساہدارک کنا روشنائی آن خوش مریرہ ولے نی اولیکو بندغ اس ہرا کنے آن بد دیسہ وای ناخاطر داخس بھلو مخلوق و داخس ساہدار تا اُست ءِ کبین کننگ کپرہ۔‘‘

ای مخاٹ پاریٹ ’’کنے داخاطر آن نے آن بدبفک کہ نی روشنائی کیسہ بلکن کنے نے آن داخاطر آن بدبریک کہ نی ہراتم چانڑ دہی مریسہ روشنائی کیسہ گڑا غرورٹی بریسہ، سمجھسہ کہ کل آن زیبا اُٹ، عقل منداُٹ، دانا اُٹ، دا

ایلوتیوہ غاک کنا روشنائی نامحتاج ءُ اگہ ای مفروسٹ گڑ ادا امرزند گدریفرہ، داکل کنامحتاج ءُ دافتا زندءِ ای انداس جوڑانٹ۔

ایلونی تینا روشنائی ٹی ہنداخس مغرور مریسہ کہ آسمان ءِ زیبدار کروکا استار تے ہم تینا مون ٹی حقیر سرپد مریسہ، چانڑدہی ٹی تینا ہنداخس مغرور مریسہ کہ بیوس آ استا تا روشنائی ءِ ہم گم کیسہ، نے اشکن للک کہ تُو ہ ئٹی اسہ وارنا چانڑدہی آ روشنائی آ دا جہان تُو ہ رستا چلیک، اگہ نی دا سوچسہ تو داہیت آک، دا بھلنی، دا مغروری اسہ دے اس نے تیوی جہان ئٹ تنیا کیک، نی اندن تنیا مروس کہ نہ مسافر سفر کرو نا روشنائی ٹی نہ کہ شاعر شئر لکھو، نہ کہ عاشق تینا محبوب نا عکس ءِ پٹو نا تہٹی، نا کہ پین کس غرض کرونے۔ پگہ نا تنیائی آن جوانے اینو پوہ مر تینے، دا غرور دا لخ نا بڑزکننگ، ہیت کننگ بھازا تے گوہانے، دُہن مف کہ نی ہم تاریخ ٹی گم مریس۔ دا بیوس آ استارک اینو بیوس ءِ نا روشنائی نا غرور ٹی گم مریرہ وا ہم بھاز مراُریر، بھازاک تا فنا مریر، بھازاک تا کسر بدل کیر، اینو نے ہچو فرق اس تمک وٹے یاد کرنا ہمسایہ ناخڑک ئناک، نا کوپہ آک ہندا استارک ء۔ اینو تینے پوہ مر اینو افتون خڑکی کہ، اینو اوفتیا مہراٹ اُردہن مف پگہ دے داورنا ءنیتون سلتو کم ازکم ہمدڑ داس تو راہ آنے مرے، پیری ٹی کس تا اس دیریٔنا تو ایتے نے۔ نے آبرو کا ماہ گیرءِ اگہ تو ننگ کتو تو کم ازکم ارمان تو کننگ کرونیکن۔"

طوبے کنا ہیت آتے بنگ۔ ٹاکواس خلک پائے نی گنوک مسونس، نی مایوس مسونس، نا دماغ خراب ئے، چار دے جہان ءِ خناس داسہ کنے پوہ کننگ اُس نی ۔۔ ہراڑے مسونس، ہراتم ودی مسونس او کان ای بھاز مالوارے گدرینگانٹ۔ ای ہرگڑاءِ چاوہ ہر ہیت ءِ پوہ مریوہ، نا ہیت آتیان پوہ مسوٹ کہ نی مایوس ءُ بندغ ئسے اُس نا ہچ منگ کپک، نا ہیت آتے ٹی کس بفک کنے آن کس مر مفک اگہ کس مرے ہم کنے کس نا پرواہ اف، کس ئنا محتاج افٹ ای ہرگڑاءِ پوہ مریوہ کنے انت کروئی ءِ انت کروئی اف، کنے نا غصہ آن فرخ تمک نہ کہ استار آتا مُر منگ آن گراس کم مریک۔

☆☆☆

دوسرا حصہ

شہید ضیاء الرحمٰن کے دوستوں کے قلم سے

ضیاءایک صبح نو کی ضیاء

برزکوہی

شورکے سینے سموک پر سجے ہوئے چار سوفٹ کے بلند و بالا یخ بستہ پہاڑی پر پوری رات سردی میں وطن کے تین محافظ پہرہ دے رہے تھے۔اپریل کا موسم بھی یہاں عجیب ہوتا ہے، پورا دن موسم خوشگوار رہتا ہے، کبھی کبھی ہلکی گرمی بھی پڑتی ہے، ہوائیں اپنے ساتھ نئے کھلنے والے گواڑخوں کا خوشبو ہر جھونکے کے ساتھ لے آتی ہیں، گھونسلوں میں چھپ کر سردیاں بتانے والے پرندے بھی اب گھونسلوں سے نکل کر اڑان بھرتے نظر آتے ہیں۔ درختوں پر نئے ہرے پتے پہاڑوں کے خاکی منظر میں ایک نئی منفرد جاذب نظری پیدا کردیتی ہیں۔لیکن جیسے ہی شام کو سورج اپنا چہرہ چھپا دیتا ہے تو گمان ہوتا ہے کہ دسمبر کی ٹھٹھراتی سردی ابھی تک چُھٹی نہیں۔اسی ٹھٹھراتی سردی میں نگرانی کرتے ساتھی، مشرق کی جانب افق پر نظریں گاڑھے سورج کے نکلنے کا انتظار میں تھے کہ صبح صادق 5 بج کر 46 منٹ پر " گھاٹ کمانڈر " نورا نے وائرلیس پر کیمپ کمانڈر کو اطلاع دی کہ دشمن کے 7 ہیلی کاپٹر مشرق کی طرف سے، 4 شمال کی جانب سے، 5 جنوب مشرق کی طرف سے اور 3 جنوب کی جانب سے پرواز کرتے ہوئے کیمپ کی جانب آرہے ہیں اور ایک جاسوسی طیارہ عین کیمپ کے قریب پہنچ چکا ہے۔کیمپ میں موجود 51 دوستوں پر مشتمل گوریلا دستے نے ایک دم برق رفتاری سے چھوٹی ٹکڑیوں میں منتشر ہوکر کیمپ کے آس پاس کے چوٹیوں پر مورچہ زن ہوگئے۔

کہیں سے ایک ساتھی سرمچار کی آواز آئی " دلو، او دلو! داغو راکٹ بے غیرتوں کے زرد ہیلی کاپٹر پر " بھگدڑ کی عالم میں، نیند سے بیدار ہوئے، لمبے، گھنے، بکھرے ہوئے بالوں، خاکی چادر سر پر باندھے ہوئے دلو (ضیاء) نے راکٹ کو کندھے پر رکھ کر اوپر پرواز بھرتے چار ہیلی کاپٹروں میں سے ایک پر نشانہ باندھنا شروع کردیا۔ ان چار ہیلی کاپٹروں میں سے دو گن شپ ہیلی کاپٹر اور دو bell 412 تھے۔

اسی وقت کیمپ کمانڈر نے دلو کو انتظار کرنے کا کہتے ہوئے رکنے کا اشارہ کیا" یہاں سے ہیلی کاپٹر کو مارنے سے، دوستوں کا لوکیشن ظاہر ہوگا اور دوستوں کی جان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔"

کمانڈر کی ہدایت سننے کے بعد دلو انتہائی پھرتی سے پیش قدمی کرتے ہوئے، تھوڑی دور واقع دوسری چوٹی پر چڑھتا ہے، اور خود کو کیموفلاج کرکے، راکٹ لانچر کندھے پر مستعد کرکے، ہیلی کاپٹروں کے پلٹنے کا انتظار کرتا ہے، تاکہ یہاں سے ہیلی کاپٹر کو مارنے سے باقی پندرہ دوست جو کمانڈر کے ساتھ ہیں، انہیں نقصان سے بچا سکے اور اپنی جان خطرے میں تنہا ڈال کر دشمن پر ایک کاری ضرب لگا کر اسکے فضائیہ کو پسپا ہونے پر مجبور کرسکے۔

سارے دوست گوریلا حکمت کے تحت پھرتی کے ساتھ اپنے اپنے پوزیشن بدلتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ دشمن جو فضائی مدد کے ساتھ ساتھ انتہائی بھاری تعداد میں ایس ایس جی کمانڈوز چاروں اطراف اتارا ہوا تھا، دشمن کے بری دستے بھی کیمپ کی جانب اپنی پیش قدمی تیز کرتے رہے۔ دشمن کا منصوبہ واضح تھا، وہ چاروں طرف سے سینکڑوں کمانڈوؤں کی مدد سے گھیر کر، آھستہ آھستہ گھیرا تنگ کرنا چاہتا تھا، اور دشمن فضائیہ اوپر سے سرمچاروں پر آتش و آہن برسا کر سرمچاروں کو مفلوج رکھنا چاہتا تھا تاکہ سرمچار گھیرا نا توڑ سکیں۔

چار گن شپ ہیلی کاپٹروں سمیت، بارہ مختلف ہیلی کاپٹروں کے ساتھ 2 جاسوس طیارے، سمسوک کو اپنے بربریت کے آغوش میں لیئے ہوئے تھے، ہر طرف دھماکوں کی آواز اور گڑگڑاہٹ تھی، راکٹوں، پٹہ مشینوں کی تھرتھراہٹ تھی، ہر طرف دھول، دھواں اور بارود کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

بارود کی اس تیز بو، دھویں اور سر پر ناچتے دشمن اور آتش اگلتے دشمن کی فضائی حملے کے دوران، اچانک ایک پہاڑی چوٹی سے، ایک راکٹ کا گولہ فائر ہوا، جو سیدھا دشمن کے ایک ہیلی کاپٹر کو لگا، جس میں آگ بھڑک اٹھی،

پھر آسمان پر سب ساتھیوں کو ایک ہیلی کاپٹر بےہنگم منڈلاتے اور پیچھے دھویں کی ایک لمبی لکیر چھوڑتے، قلات کی جانب پسپا ہوکر جاتے نظر آنے لگا، صرف چند منٹوں میں ہی وہ باقی ہیلی کاپٹروں سے الگ ہوکر کوہ ہپڑ وسی سے ہوکر قلات مین آر سی ڈی سڑک کے قریب گر کر تباہ ہوگیا۔

ایک ہیلی کاپٹر کو گرتے دیکھ کر دشمن کی باقی ہیلی کاپٹر خوفزدہ ہوکر اپنی پروازیں اونچی کرگئیں، اور دوبارہ نیچی پروازوں سے کتراتے رہے، یوں کئی مقامات پر گھیرے میں پھنسے ساتھی سرمچاروں کو موقع مل گیا کہ وہ دشمن کا گھیرا توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہوجائیں۔ اس ایک راکٹ نے دشمن کے مہینوں سے ترتیب دیئے گئے ایک بڑے حملے کو پسپا کردیا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور وہ راکٹ فائر کرنے والا دلو تھا۔ ہمارا دلو عرف دلجان عرف ضیاء اسی دن سے اپنے سینے پر ٹک تیر کا اعزاز سجانے میں کامیاب ہوا۔

ضیاالرحمان عرف دلجان کو بی ایل اے نے رسمی طور پر ٹِک تیر کا خطاب دے دیا۔ یوں بلوچ قومی مزاحمتی تحریک کی اس طویل تاریخ میں اپنی زندگی میں ہی کوئی قومی خطاب و اعزاز حاصل کرنے والے وہ پہلے سرمچار بن گئے۔

یہ 7 اپریل 2014 کا دن تھا، اس دن یہ واحد تاریخی کارنامہ نہیں تھا بلکہ ایک طرف جہاں دلو بہادری و جانثاری کی نئی تاریخ رقم کرکے ٹِیک تیر کا خطاب اپنے نام کررہا تھا، اسی میدان جنگ میں، اسی دن شہید امیر الملک "آخری گولی" کے فلسفے کا بیج بونے جارہا تھا۔ ایک طرف دلو اپنے "ٹِک" نشانے سے دشمن کے فضائیہ کو پسپا ہونے پر مجبور کررہا تھا، دوسری طرف شہید امیر الملک ایک دستے کی کمان کرتے ہوئے، دشمن کے اعلیٰ تربیت یافتہ ایس ایس جی کمانڈوز کو ناکوں چنے چبوا کر انکا گھیرا توڑ کر، اپنے کئی ساتھیوں کو بحفاظت نکالنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

دشمن کا گھیرا توڑتے اور باقی ساتھیوں کیلئے محفوظ راستہ بناتے بناتے شہید امیر الملک اپنے دو جانباز ساتھیوں شہید صمد زہری عرف شیرا اور شہید گزین کے ساتھ ملکر سمسوک کے ایک گھٹ میں مزاحمت کی ایک تاریخ رقم کر کے دشمن کی لاشیں بچھا چکا تھا۔ جسکی وجہ سے دشمن نے اپنے تمام کمانڈوز کا رخ انکی جانب کر دیا تھا۔ ایک طرف باقی دوستوں کو اس مزاحمت کیوجہ سے نکلنے کا موقع مل گیا لیکن یہ تینوں جانثار گھیرے میں آ گئے تھے، لیکن یہ سرمچار آخری دم تک مقابلہ کرتے رہے۔ اپنے باقی دونوں ساتھیوں کی شہادت اور گولیاں ختم ہونے کے بعد شہید امیر الملک نے یہاں وہ تاریخی فیصلہ لیا، جو "آخری گولی کے فلسفے" کی صورت میں آج سات سال بعد بھی دشمن کیلئے ایک واضح پیغام ہے کہ بلوچ کیلئے آزادی اور موت کے بیچ اور کوئی درمیانہ راستہ قابل قبول نہیں۔

شہید امیر الملک قلندرانی عرف جمال نے سالوں سے اپنے جیب میں الگ رکھے گولی کو بندوق کے چیمبر میں لوڈ کر کے گولی اپنی حلق میں اتار دی۔

7 اپریل 2014 کو اس پہاڑی چوٹی پر اکیلے دلجان چڑھا تھا، لیکن وہاں سے وہ اکیلے نہیں اترا تھا۔ بلکہ اترنے والا ایک ہی وقت میں، پرانا دلو، ٹِک تیر اور امیر بھی تھا۔ اس دن کے بعد سے دلجان نا صرف اپنی ساری ذمہ داریاں نبھاتا رہا بلکہ اس نے اپنے سَر شہید امیر الملک کی ذمہ داریاں بھی لیلیں۔ اس نے اپنے سَر صرف امیر کی ذمہ داریاں ہی نہیں اٹھائیں بلکہ اسکی روایت بھی اسکے لاش کو کندھا دیتے اٹھالی، دلو نے امیر کی طرح اسی دن، ایک گولی الگ کر کے اپنے جیب میں رکھ لی۔

پھر یہی ذمہ داریاں اسے شور سے ناگاہو، ناگاہو سے بولان اور بولان سے تراسانی لے گئے۔

19 فروری 2018 کو دلجان کو ذمہ داریوں کا یہ بار اپنے ساتھی بارگ جان کے ساتھ تراسانی زہری لے آتی

ہیں۔ وہ زہری جس نے اسے خوبصورتی کے معنی بتائے، مزاحمت کی معنی سِکھائی، عشق کے سبق پڑھائے اور غلامی کے تپش کی لمس بھی محسوس کرائے۔ آج وہی زہری تمام پڑھائے اسباق اور سکھائے عشق کا اس سے امتحان لینے والا تھا۔ دلواور بارگ دشمن کے گھیرے میں آ گئے تھے، بارگ کی بندوق کرائے کے سپاہیوں پر گرج رہی تھی اور اور ٹِک تیر کے تِیر دشمن کے پرخچے اڑاتے جارہے تھے۔ وہ مزاحمت کے کسوٹی پر پورے اترے، اب پیاسی دھرتی کو عشق کا امتحان لینا تھا۔ دونوں کی گولیاں ختم ہوگئیں۔ بندوقیں خالی لیکن جیب خالی نہیں، جنون خالی نہیں، عشق خالی نہیں۔ آخری گولی کا فلسفہ اور دونوں کے حق سے گولی پار ہوئی۔ دلجان اور بارگ، امیر کے پاس چلے گئے اور دشمن کے ہاتھوں محض ٹھنڈے جسم ہی لگے۔

ایک رمانی کہاوت ہے کہ شہیدوں کے جسم پر شہادت کے وقت جو زخم لگتے ہیں وہ اگلی زندگی میں واضح سیاہ تِل بن کرا بھر کر انہیں ممتاز کرتے ہیں۔ دلجان جیسے ہی امیر سے ملا ہوگا، اپنے حلق پر بنے نئے سیاہ تِل کو دِکھاتے ہوئے بولا ہوگا کہ "دیکھ یار! تجھ کو تنہا نہیں چھوڑا، اور نا ہی مجھے تنہا چھوڑا جائے گا، نا تیرا رستہ ویران رہا اور نا ہی میرا رستہ ویران رہے گا۔"

☆☆☆

دلجان بیوفا نہیں تھا۔۔۔

تحریر:صہیب بلوچ

''ہم یہ جنگ جیتیں گے، تبھی یہ بچے نئے کپڑے اور جوتے پہن کر اسکول جا سکیں گے، ہم اس جنگ سے منہ موڑ لینگے تو ایسے ہزاروں بچوں کی وابستہ آخری امید بھی ٹوٹ جائیگی"۔

ان الفاظ کے ساتھ اپنی شہادت سے ایک روز قبل شہید دلجان نے یہ تصاویر مجھے وٹسپ پر ارسال کر کے "رخصت اَف اوارُن" کی برچھا دل میں اتار کر، رخصت ہو گیا۔

نجانے یہ تصویریں اس نے بلوچستان کے کس پہاڑ، بستی یا کوچے میں کھینچی تھی، کیونکہ وہ ایک جگہ رک کر مناسب وقت کا انتظار کرنے والوں میں سے نا تھا، وہ ہر وقت اس جتن میں رہتا کہ وقت چاہے جیسا بھی سخت ہو، اسے کام کیلئے مناسب بنایا جائے۔

نفرت جان لینا سکھاتی ہے، لیکن یہ خوشی خوشی جان دینے کی روش، بس محبت سکھاتی ہے۔ دلجان کو اسی محبت نے آخری گولی سر میں اپنے ہی ہاتھوں سے اتروا دیا، اپنی مٹی کی خوشبو سے محبت، اپنی سرزمین کے ان بلند پہاڑوں کے غرور سے محبت، اپنی زمین پر اگنے والے گواڑخوں کی مہک سے محبت، اپنی قوم کے برہنہ پیر سردی میں ٹھٹھرتی، مٹی میں لتھڑے بچوں کی معصوم سی مسکراہٹ سے محبت۔۔۔ دلجان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور دلجان بیوفا نہیں تھا، وہ محبت میں جان دینے والے دیوانوں میں سے تھا، سو جان دے گیا۔

☆☆☆

ضیاء۔۔۔۔۔الوداع

تحریر: عالیان یوسف

چندایسی کتابیں نظر سے گزری ہیں جن کو پڑھ کر بندہ چند لمحوں کے لیے زماں ومکاں سے غافل ہوجاتا ہے
واپس اپنی جگہ پر پہنچنے میں دیر لگتی ہے اور پہنچنے کے بعد ڈبڈباتی آنکھیں اور گلے سے اترتی نمکین پانی احساس
دلاتی ہے کہ لکھاری نے کمال ہنر سے اپنی لکھی کہانی کے تمام کرداروں کو میرے احساسات کا رشتہ دار بنایا ہے۔
اپنی کہانی کے ہر کردار میں میرے درد کو جو میری کمزور جان میں بکھری ہوئی شکل میں موجود ہے سمیٹ کر ایک
مسلسل درد کا گولہ بنا دیا ہے اس بات سے لکھاری کو کوئی غرض نہیں کہ ہمارا ایک ایسے سماج سے تعلق ہے جہاں
تنہائی میں بھی آنسوؤں کو پینا پڑتا ہے اور اگر آنکھیں بھر آئیں اور کتاب کے الفاظ آپس میں گڈ مڈ ہوجائیں تو
فوراً آنکھیں صاف کر کے کناروں سے آنسو پونچھ کر کہانی کار کی درد بھری تخلیق کی لذت سے نہ چاہتے ہوئے
بھی نکل آنا پڑتا ہے کہیں کوئی دیکھ نہ لے حالانکہ جی چاہتا ہے کہ اس کیفیت کے لطف میں تھوڑی دیر اور ڈوب کر
رہا جائے اور کہانی کار جو میرے دیس اور میرے وطن کے حالات سے غافل اپنے تخیلاتی وسعتوں، سوچ اور
قلم کی روانی پر نازاں ہے کو داد دیا جائے۔ حالیہ دور میں کتابوں کے بجائے سوچوں پر غلطاں کرنے اور
آنسوؤں میں ڈبونے کی ذمہ داری سوشل میڈیا نے لے لی ہے۔ بلوچ، بلوچستان، اور بلوچ تحریک آزادی
سے جڑے تمام لوگوں کے لیے تو سوشل میڈیا کی وسعت ایک دو درد بھرے عنوانات سے آگے گزر ہی نہیں
پاتی۔ یہ عنوانات یا تصاویر ایک گمشدہ نوجوان کی تصویر سے شروع ہوکر خون میں لت پت ایک جہدکار کی
شہادت کی مسکراتی تصویر پر ختم ہوجاتی ہیں، موضوعاتی وسعتیں، تخلیقی صلاحیتیں سوچ کی پرتیں اک دم رُک سی
جاتی ہیں۔

آج ہی کی ایک تصویر ہے آنکھوں کے سامنے، جس میں کل زہری کے علاقے تراسانی میں ریاستی فورسز کے ساتھ جھڑپ میں جام شہادت نوش کرنے والے جہد کار کمانڈر ضیاء الرحمٰن عرف دلجان کی والدہ شہید کی پیشانی کو فخریہ اور بلند حوصلے سے الوداعی بوسہ دے رہی ہیں۔ بلوچستان پر ندر ہونے والے اپنے فرزند کے ماتھے پر مہربان ہاتھ رکھ کر دوسروں کو حوصلہ دے رہی ہیں، اپنے شہید بیٹے کی اس قول کا پاس بھی رکھ رہی ہیں کہ ''ماں جب بھی یہ سنو کہ میں شہید ہو گیا ہوں تو رونا نہیں آنسو نہیں بہانا''

دلجان نے یہ بات شاید اس لیے کہی ہوگی کہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ شہادت کا اعزاز پانے کے بعد وطن کے آغوش میں آسودہ خاک ہونے سے پہلے ماں کے مقدس اور مہربان بوسے کو اپنی چمکتی پیشانی پر لینے کا اعزاز بھی حاصل کریں گے۔ دلجان نے ایک طرف شہادت کا میڈل سینے پر سجالیا تو دوسری طرف کوہِ ملغوے کے دامن میں اپنے آبائی علاقہ تراسانی کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے وطن کے محافظین شہداء کے ان ارمانوں کی لاج بھی رکھ لی کہ بلوچ تحریک آزادی کی خمیر جس مٹی سے اُٹھی ہے وہ سرزمین بانجھ نہیں ہے اس مٹی سے ایسے دلیر سرمچار اور پختہ فکر جہدکار اس وقت تک جنم لیتے رہیں گے جب تک کہ غلامی کے یہ اندھیرے ضیاء کے سامنے شرمندہ نہ ہوں، ضیاء خود ایک روشنی ہے اس لیے ضیاء کے سینے سے بہنے والے ہر ایک خون کے قطرے سے ایک نئی روشنی نمودار ہوگی، اس روشنی سے شعور بھی پھوٹے گی، اور سوچ کی وسعتوں کی بھی فراوانی ہوگی اس روشنی سے صدیوں سے سوگوار کالے رنگ کے گدانوں کا رنگ بدلے گا گدانوں کے باسی جو مہروان راہوں کے مسافر ہیں اور جو ہمیشہ اپنے مثبت روایات کا نگہبان رہے ہیں۔

جن کے سینے کی کشادگی درہ مولہ کی طرح فراخ ہے اور سربلندی پیازی اور ملغوے کے چوٹیوں کی طرح بلند. وہ ضیاء کے آخری قہقہے کی طرح ظلمتوں کی کم عمری پر قہقہے لگائیں گے۔ اندھیروں کو مات دینے کا ہنر صدیوں سے ان کی سرشت میں شامل ہے۔ یہ روشنی عاجزانہ اور انکساریت کی روشنی ہوگی اس کے سامنے اندھیروں کے پالنہار تکبر زادے بونوں کی طرح نظر آئیں گے ان تکبر زادوں کی ساری نخوت خاک میں مل جائے گی اور

وہ مقدس خاک بھی انہیں قبول نہ کر پائے گی کیونکہ یہی مقدس خاک اس روشنی کی ماں ہے اور وہ روشنی کے کشادہ پیشانی کو اس لیے فخر سے بوسہ دے رہی ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ روشنی کبھی مرتے نہیں وہ صرف مدھم پڑ جاتے ہیں دوبارہ سے تاریکیوں کا سینہ چیر کر اپنے کرنوں سے اپنے وجود کا احساس دلا ہیں گے اور وطن کے کونے کونے میں اپنی سوچ کی فکر اور آزادی کی اُجالا پھیلائیں گے۔

☆☆☆

میرے دھرتی کے سچے عاشق

تحریر: ثاقب بلوچ

میری زندگی میں شاز ونادر ہی ایسے لمحے آتے ہیں کہ میں لاجواب ہوتا ہوں، کہنے کو بہت کچھ کہنا چار رہا ہوتا ہوں لیکن کچھ کہہ نہیں پاتا، ہاتھ کانپنے لگ جاتے ہیں جسم میں ایک ترتراہٹ سا محسوس ہوتا ہے، بہت سنبھلنے کو چاہتا ہوں لیکن میرے جسم پہ، میری سوچ پہ، میرے روح پہ میرا کنٹرول نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے میرا وجود مجھ سے دور بھاگتا جارہا ہے اور میں سکتے میں کچھ نہیں کر پارہا ہوں۔ ان لمحوں کو میں محسوس کرنا چاہتا ہوں، ان لمحوں کو میں اپنے اندر سمیٹنا چاہتا ہوں ان لمحوں کو میں صرف لمحے اور پھر ہوا میں تحلیل کرنا نہیں چاہتا۔

آزادی کے اس کارواں میں کم وبیش تقریباً 12 سال سے سیاسی پلیٹ فام سے ہمسفر رہا ہوں، سینکڑوں واقعات ان آنکھوں نے دیکھیں، کچھ دل دہلانے والے واقعات، کچھ جگر کو پارہ پارہ کرنے والے واقعات، کچھ اپنے آپ کو فنا کرنے والے واقعات اور کچھ بے مقصد وجود والے واقعات لیکن شہید دلجان و بارگ جان کی شہادت نے مجھے یہ سوچنے پر ایک دفعہ پھر مجبور کردیا کہ آخر بہادری، ہمت، جذبہ، جوش، شعور، جرات اور نظریہ کا پیمانہ کیا ہوتا ہے؟ کیا کوئی انسان اس قدر بہادر ہوسکتا ہے کہ بغیر کسی لالچ، بغیر کسی ذاتی مفاد، بغیر کسی ذاتی مراعات، بغیر کسی خاندانی لالچ، بغیر کسی قیمت کے کئی کئی سال بھوکے پیاسے زخموں میں خون سے لت پت ان ویران پہاڑوں میں گزارے جہاں عام انسان دن کو بھی جانے سے ڈرتا ہو۔ کیا ایک سوچ اس قدر بھی پختہ ہوسکتا ہے کہ آپکو ماں کی گود سے اپنی طرف کھینچ لے اور ماں دنگ رہ جائے؟ کیا ایک نظریہ اس قدر پختہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو باپ کی چھاؤں سے کھینچ کے تپتی دوپ میں لے جائے اور باپ سکتے میں رہ جائے؟ کیا ایک فکر اس قدر مضبوط ہوسکتا ہے کہ آپ کو آپ کی پھول جیسی بہن جس کو آپ کے کندھوں کی ضرورت ہو آپ

کو کھینچ کے ایسے لے جائے کہ سالوں آپ اس بہن کی آواز تک نہ سن سکو، کیا ایک مقصد اس قدر پختہ ہوسکتا ہے کہ جس بھائی کو ہر لمحہ آپکی ضرورت ہو اور وہ مقصد آپ کو ایسے کھینچ کے لے جائے پھر واپسی کی کوئی امید ہی باقی نہ ہو!

جی ہاں وہ پختہ سوچ، وہ پختہ نظریہ، وہ پختہ فکر، وہ پختہ مقصد دھرتی ماں ہے، وہ دھرتی ماں جس کی کوکھ سے ہم جنم لے چکے ہیں، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں چلنا سکھایا، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں ایک پہچان دی، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں سانس لینا سکھا دیا، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں آواز دی، وہ دھرتی ماں جس نے بغیر کسی غرض کے ہمیں کھلایا پلایا، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں وجود دی، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں ہمت دی، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں عزت دی، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں غیرت دی، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں ایک الگ قومی شناخت دی، وہ دھرتی ماں جس نے ہمیں اپنایا۔ آج جب اس دھرتی ماں نے ہمیں آواز دی کہ اے میرے فرزند اب مجھے آپ کی ضرورت ہے، اب اٹھ کہ غیروں نے مجھے للکارا ہے، اے میرے لال اب اٹھ کہ غیروں نے مجھے اپنی گندی نظروں سے دیکھا ہے، اے میرے لختِ جگر اب اٹھ کہ ظالم نے میری کوکھ پہ اپنی غلیظ و ناپاک نگاہ ڈالی ہے، اے میرے نورِ نظر اب اٹھ کہ تیری ماں محفوظ نہیں ہے، اے میرے بہادر جانباز اب اٹھ کہ تیری ماں کی شال دشمن کی ناپاک مٹھی میں ہے، اے میرے نڈر فرزند اب اٹھ کہ تیرے باپ کی عزت محفوظ نہیں ہے، اے میرے ہمدم اٹھ کہ تیری پھول جیسی بہن کی عزت کو ظالم تار تار کرنے والے ہیں، اے میرے پھول اب تو اٹھ جا نہیں تو تجھ پہ میری پاکیزہ دودھ کا وہ قرض کبھی معاف نہیں ہوگا جسے میں نے تجھے پلایا۔

دھرتی ماں کی اس پکار پر ہزاروں بلوچ فرزندوں نے لبیک کہہ کر دھرتی ماں کی رکشا کرنے سرمئی پہاڑوں کو اپنا مسکن بنالیا ہزاروں نے سیاسی پلیٹ فام سے جدوجہد شروع کی تو ہزاروں نے مسلح ہوکر دشمن کو للکارا، ایسے میں شہید نورالحق عرف بارگ جان اور ضیا عرف دلجان سیاسی پلیٹ فام سے اس کاروان آجوئی میں شامل ہوکر

دھرتی ماں کا قرض ادا کرتے رہیں۔سیاسی پلیٹ فام پہ جب کام کرنا مشکل تر ہوتا گیا تو دھرتی ماں کے ان جانباز فرزندوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مسلح محاذ ہی ایک واحد راستہ ہے جہاں سے ہم اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھا سکیں گے اور پھر یہ بہادر سپوت تادمِ شہادت مسلح جدوجہد سے ہی جڑے رہیں۔ ویسے تو ان جانباز فرزندوں کی بہادری ان کی جرات اور ایمانداری قابلِ دید تھی۔مگر ساتھ ہی ساتھ وہ جہدِ مسلسل اور علمی میدان میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔سنگت دلجان کے کئی مضامین سوشل میڈیا میں موجود ہیں جو ہم جیسوں اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ وہ وقت کیسا ہوگا جب ایک انسان کو پتہ ہو کہ وہ فنا ہونے والا ہے یا وہ اب مرنے یا جام شہادت نوش کرنے والا ہے اس کے تاثرات کیا ہونگے، وہ کیا سوچ رہا ہوگا؟ اس کا دفاع اس کو کیا کہہ رہا ہوگا؟ اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے اس کو کیا سوچنے پہ مجبور کرر ہا ہوگا؟ دنیا میں اکثر لوگ بغیر مقصد جیتے ہیں اور بغیر مقصد کے ہی مر جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے، وقت بدلتا رہتا ہے ان کی قبروں کی مٹی ہوا میں تحلیل ہو کر چلی جاتی ہے اور کرتے کرتے ایک دن ایسا بھی آجاتا ہے کہ ان کا نام ونشان تک اس دنیا سے مٹ جاتا ہے، مگر دھرتی ماں سے عشق مادرِ وطن سے محبت ہی وہ واحد ذریعہ و راستہ ہے جو انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رکھتا ہے اس کو دوسروں کے لیے ایک روشنی بنا دیتا ہے۔اس کو باقیوں کے لیے ایک چراغ و امید کی کرن اور ایک مضبوط نظریہ بنا دیتا ہے۔دوسرے اس کی طرز عمل اور زندگی سے متاثر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو سکتے ہیں۔

وہ لمحہ کیسا ہوگا جب شہید دلجان و شہید بارگ جان اپنے اپنے کلاشنکوف دیکھیں ہونگے؟ کہ اس سے دشمن پہ تیر برسانا بند ہوا ہے اس وقت ان کے تاثرات کیا ہونگے؟ وہ ایک دوسرے کو کیا کہہ رہے ہونگے؟ ان کی بیچ کا مکالمہ کیسا ہوا ہوگا؟ کاش وہ وقت وہی تھم جاتا اور ہم وہاں ان کے بیچ موجود ہوتے اور ان کی گفتگو سن لیتے، وہ گھڑی کیسی ہوئی ہوگی جب سامنے سے دشمن یہ آواز لگا رہا ہوگا کہ ہتھیار پھینک دو ہم تمہیں نہیں ماریں گے اور اس

وقت شاہِ شہیدان دشمن کو کیا جواب دیئے ہونگے ؟ اور دشمن ان کا جواب سن کہ وہی خاک میں مل چکا ہوگا ، وہ لمحہ بھی دنگ رہ چکا ہوگا جب دو بہادر سپوت ایک دوسرے کو گلے لگا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ چکے ہونگے ، وہ ساعت ، وہ لمحہ ، وہ گھڑی ضرور قابل دید ہوگی جب دونوں جانباز اپنی اپنی آخری گولیاں چھوم کر پھلین امیر جان کے کاروان میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہونگے ....

دھرتی ماں کی قبضہ زدہ خشک اور حسین وجمیل مگر دولت سے مالا مال سوکھی مگر مہر ومحبت کی زمین کو آبیار کرنے کی خاطر اسکے حقیقی سپوتوں اور فرزندوں نے شعوری فکری اور نظریاتی موجودگی اور وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سرخ لہو دے کر دھرتی ماں کا قرض کو ادا کرتے ہوئے آزادی کا نشانی قومی بیرک کو بلند و بالا کیا ہوا ہے ، دھرتی ماں کا قرض کو ادا کرنے کے لیے جن بلوچ فرزندوں نے مادرانہ سلوک کا عیوض دیتے ہوئے اپنی زندگیاں کو قربان کر دیا اور وہ سپوت قومی تاریخ میں قومی تاج سر پر پہن کر جام شہادت نوش کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پوری قوم پر حکمران رہے۔

☆☆☆

ٹک تیر شہید دلجان

تحریر: مرید بلوچ

ضیاء نجانے اس ایک لفظ کی تشریح کو سمجھنا آج اتنا مشکل کیوں ہو رہا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ شاید اس ایک لفظ میں دنیا بھر کی اتنی روشنی سمائی ہوئی ہے کہ ذہن اس روشنی کو قبول نہیں کر پا رہی اور کبھی سوچتا ہوں کہ زمین کی تہہ سے سطح تک اور اس سطح سے فلک تک اور فلک سے کائنات کے آخری حد تک جتنی تاریخ ہوگی اس لفظ میں سمائی ہوئی ہے تب ہی اس لفظ کو سمجھنا اس قدر ناممکن لگ رہا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ یہ چند الفاظ جو میں سیکھ چکا ہوں ایک لفظ کے سامنے ہی سر جھکا گئے آج اس ذہن اس علم اس شعور کا اختیار کس قدر محدود لگ رہ گیا ہے۔ بہت کچھ کہنے کی خواہش ہے، بہت کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے مگر، لکھوں تو کیا لکھوں، کہوں تو کیا کہوں آج وہ وقت نہیں کہ ضیاء کو سمجھنے کے لئے ضیاء سے ہمکلام ہوسکوں کچھ پوچھ سکوں اپنی کیفیت بتا سکوں اور نہایت ہی پرسکون اور خاموشی کے ساتھ میرے وجود میں برپا اس شور و کوسن کر پیار سے چند ہی الفاظ میں اپنی پوری بات کہہ کر سمندر کے لہروں سی اس کیفیت سے، اس بے چینی سے مجھے آزاد کرا سکے۔

ضیاء ایک ایسا نام جس کو سنے سالوں ہو چکے تھے، ضیاء ایک ایسا چہرہ جسکو دیکھے عرصہ گزر چکا، ضیاء ایک ایسی آواز جسے سننے کے لئے کان ترس گئے تھے بس یاد تھا تو ایک ہی لفظ ضیاء۔ اور اس لفظ کو جتنا محدود سمجھ سکا صرف اتنا ہی سمجھ سکا کہ ضیاء کا مطلب ہی ضیاء ہے جسکی روشنی محسوس کی جاسکتی ہے جسکی چمک سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جسکی حرارت سے راحت مل سکتی ہے اور جسکے رنگ سے یہ بے رنگ دنیا رنگین ہوسکتی ہے مگر جسکو مکمل جاننا، سمجھنا، حاصل کرنا کسی کے بس میں نہیں۔

کہتے ہیں دنیا میں وہی عظیم شخص ہوتے ہیں جنکی زندگی اور خدمات دوسرے لوگوں کے لئے قربان ہوتی ہے جنکو بزدلی و بہادری کے درمیان فرق کا علم ہوتا ہے جنہیں ظالمیت و مظلومیت کا احساس ہوتا ہے جنہیں آزادی و غلامی کا شعور ہوتا ہے جو محبت و نفرت کے اصولوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور ایسے عظیم شخصیات کی پیدائش سالوں یا صدیوں میں ہوتی ہوگی۔ وہ ماں کتنی خوش قسمت ہوگی جسکی کوکھ سے ایسا فرزند جنم لے رہا ہو۔ وہ خاندان وہ دوست احباب سے خدا کس قدر خوش ہوگا جنکے نصیب میں ایسے شخصیات کی سنگت عطا کی ہوگی اور اس سرزمین کی اس وقت کیا کیفیت ہوگی جس پر بیشمار بے حسوں کے بعد ایک ایسی شخصیت نے قدم رکھا ہوگا۔

آج سے تقریبا ۳۰ سال قبل بلکل ایسی ہی خوشی کا احساس ایک ماں کو ہوا گا جب اسنے ضیاء کو جنم دیا ہوگا اور اس خوش نصیبی کا احساس اس والد اور اس کے خاندان کو ضرور ہوا ہوگا تب ہی تو اس نام ضیاء پر متفق ہوئے ہونگے اور اس سرزمین کا سر فخر سے اس وقت کس قدر بلند ہوا ہوگا جب ضیا کا سایہ زمین پر پڑھ کر زمین کو روشن کیا ہوگا اور اس زمین کے سامنے چرخ کہن بھی شرمندہ ہوا ہوگا کہ کاش اس شخص کے پاؤں کی دھول اسے بھی مہکا دیتا اس ضیا کا سایہ اسے بھی روشن کر دیتا۔

دنیا کی نظروں کے سامنے رہتا یہ عام سا چہرہ ہر وقت ایک مسکراہٹ چہرے پر لیا ہوتا تھا۔ اس کی اس مسکراہٹ کی مٹھاس سے میں اسی وقت واقف ہو چکا تھا جب پہلی بار اس سنگت کا دیدار ہوا اور ہم کلامی کے بعد معلوم ہوا کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے لامحدود شعور چھپا ہوا ہے۔ مگر اس سنگت کی سوچ اسکے مقصد اسکی منزل کا اندازہ اس وقت لگانا ناممکن تھا۔ یوں تو سنگت اس طرح تیاری کے ساتھ بچھڑا کہ یقین ہو چلا تھا کہ سنگت اپنی تعلیم مکمل کر نے کے بعد کسی نوکری کی تگ و دو میں ہے اور دنیا جہاں کی طرح اس سنگت کو بھی اب فکر ہو گیا ہے کہ اب کچھ وقت اپنے بچوں اور خاندان کے نام وقف کر دوں اس ذمہ داری کو پورا کروں جس ذمہ داری کا احساس ہر عام شخص کو باشعور ہونے پر ہو جاتا ہے۔ مگر مجھ سمیت یہ دنیا اس بات سے انجان تھا کہ وہ کوئی عام شخص نا تھا بلکہ وہ عظیم شخص ضیاء تھا جسکا مقصد اس قدر محدود نا تھا اسکی منزل اتنی قریب نا تھی وہ تو بڑے منزلوں کے مسافروں

میں سے ایک مسافر تھا جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر ضیا کے نام کو گمنام کر کے دلجان کی شکل میں ایک قرض اتارنے، سرزمین بلوچستان کی دفاع کرنے اور اس مادر وطن پر دشمن کی ناپاک نظروں کو آنکھوں سمیت نکال باہر پھینک کر تباہ و برباد کرنے جا چکا تھا۔ وہ تو اپنی زندگی بجائے بیوی، بچے، ماں، باپ بھائی بہن کے نام کرنے کے قوم کے نام کر گیا تھا۔ اس قوم کے نام جو حقیقت سے کوسوں دور اپنی زندگی میں مگن تھا۔ جسے اپنے مظلومیت کا احساس تھا نا کہ مادر کی غلامی کا شعور اور نا ہی ان عظیم دھرتی کے فرزندان وطن ضیا و امیر، شکور وحق نواز، جاوید و نثار سمیت ہزاروں نامی و گمنام سپائیوں کے حوصلے، جذبے، ارادے اور مقصد سے واقفیت رکھتا تھا جو انکے لئے اپنا سب کچھ قربان کر کے انکی حفاظت پر ہر وقت مامور تھے۔ جو اس قوم کے پر سکون نیند کے لئے تاریخی رات میں بیدار دشمن پر نظرے جمائے بندوق ہاتھ میں لئے اس قوم کے دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار تھے اور نجانے کتنی بار کتنے کتنے گھنٹے، کتنے کتنے دنوں تک دشمن کی یلغار کے سامنے ڈٹے رہ کر اسکا منہ تھوڑ جواب دیتے رہتے تھے۔ دشمن ہمیشہ سرزمین بلوچستان کو خون سے نہلانے کی نیت سے تو آتا مگر ہار کر بھاگ نکل جانے پر مجبور ہو جاتا کیوں کہ اس سرزمین کی حفاظت میں سرمچار بیدار تھے اور ہار تو دشمن کے مقدر میں تھا کیونکہ ان سرمچاروں میں سے ایک سرمچار کمانڈر ٹک تیر تھا اور ٹک تیر سے دشمن فوج بخوبی واقف تھا۔ دشمن کی مکمل تیاری، بے شمار فوجیاں، جدید ہتھیاریں، ہیلی کاپٹر اور جیٹ طیارے بھی ٹک تیر اور اسکے سنگتوں کے حوصلوں سے نا بچ سکے اور دشمن ہر بار ٹک تیر کا نشانہ بن کر ہار ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ٹک تیر سنگت ضیا دلجان بلوچ زندگی کی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ زندگی کبھی بھی دغا دے کر ساتھ چھوڑ سکتی ہے اور انسان دنیا سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا ہے مگر مٹنا تو عام لوگوں کی صفت ہے اور عظیم شخص تو امر ہو جاتے ہیں تو ٹک تیر کیوں نا امر ہوتا۔ اس امر کی چاہت نے، زمین کی محبت نے ایک بار پھر ٹک تیر کو مجبور کر دیا کہ اسی زمین پر قدم رکھے جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اسکا بچپن گزرا تھا جہاں کی زمین اب پیاسی تھی اور اس پیاس کو ضیا ہی بجھا سکتا تھا دلجان ہی بجا سکتا تھا ٹک تیر ہی بجھا سکتا تھا۔ انیس فروری کی صبح ایک بار پھر ضیا ہنستے مسکراتے سنگتوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے اس سرزمین پر پہنچ گیا جہاں مادر وطن کے ساتھ ساتھ دشمن بھی

اسکے انتظار میں تھے۔ضیاء دلجان کو مادروطن سے اپنی محبت کا اظہار کرتے،اسکی خوبصورتی،اسکی مہک،اس سے ہمکلامی سے لطف اندوزی میں تھوڑا ہی دیر گزرا تھا کہ دشمن بڑی تعداد میں ناپاک ارادوں کے ساتھ حملہ آور ہوا کہ شاہد اس بار دشمن کو کامیابی ملے اور کوئی سنگت یا تنظیمی راز اسکے ہاتھ لگے گا مگر سنگت ٹک تیر اور بارگ جان کے حوصلے اور بہادری نے دشمن کو حواس باختہ کر دیا اور دشمن کو ایک بار پھر زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔سنگت ٹک تیر اور سنگت بارگ جان نے اکٹھے دشمن کی اتنی تعداد اور جدید ہتھیاروں کا مقابلہ اس وقت تک کیا جب تک انکے بندوق کی ایک ایک گولی دشمن کا سینہ چھیرتی نا گئی۔مقدس تنظیم کی طرف سے ملی ہر ایک گولی کا قرض ادا کرنے کے بعد دونوں جانبازوں نے تنظیموں رازوں کو دشمن کی شر سے محفوظ رکھنے اور اپنے سینے میں دفن کرنے کے لئے اس آخری گولی جو ہر سرمچار کی امانت ہوتی ہے بندوق میں ڈال کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکراتے،دشمن کی ہار کا جشن مناتے،آزادی کے خواب لئے وطن کی ہواؤں میں اپنی مہک چھوڑ کر سرزمین کی پیاس اپنے لہو سے بجھاتے تاریخ میں امر ہو گئے اور ہمارے لئے ایک سوال چھوڑ گئے کہ کیا چاہتی ہے ہم سے ہماری یہ زندگی کیا قرض ہے جو ہم سے ادا نہیں ہو رہا۔

چندر شیکھر آزاد سے ضیاء الرحمان عرف دلجان تک

تحریر: زوہیب بلوچ

چندر شیکھر آزاد آگ لگانے والا انقلابی تھا، جس نے اپنے ملک کی آزادی کیلیئے زبردست لڑائی لڑی، بھگت سنگھ کے اس ہم عصر کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ وہ برطانوی حکومت کیلیئے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کر سکے ۔۔ان کی مشہور تقریر، دوشمان کی گلون کا سلمنا ہمارا کرینگ،/آزاد ہیلو راہ ہو، اور آزاد ہیلو راجن'، (میں دشمنوں کی گولیوں کا سامنا کروں گا، میں آزاد ہوں اور میں ہمیشہ آزاد ہوں۔) انہوں نے اپنے معاصروں کے دلوں میں قوم پرستی کے سخت احساسات کو جنم دیا۔

چندر شیکھر آزاد، چاند شکر ٹوری، 23 جولائی، 1906 کو پانڈ اٹ سٹی رام تیاری اور مدھدی پردیش کے جاوواو ضلع کے بھورگاؤں میں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے علاقے میں رہنے کے دوران تیراندازی کے ساتھ ساتھ کشتی رانی سیکھا۔انہوں نے بھورہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ وارانسی میں ایک سنسکرت پاٹشالہ گئے، ایک طالب علم کے طور پر وہ اوسط تھا لیکن ایک بار بنارس میں، وہ بہت سے نوجوان قوم پرستوں کے ساتھ رابطے میں آ گئے پھر آزادی کے شاہراہ پر ہو لیئے۔

27 فروری، 1931ء چندر شیکھر آزاد دوستوں کے ساتھ ملاقات کرر ہا تھا، پہلے سے باخبر پولیس نے پارک کو گھیر لیا اور چندر شیکھر آزاد کو ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ آزاد اپنے دوستوں کو محفوظ راستہ دینے کے لئے آزادی سے لڑا اور تین پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا۔ اگر چہ ان کی شوٹنگ کی مہارت بہت زیادہ تیز تھی لیکن وہ سخت زخمی ہو گئے اسکی گولیاں ختم ہونے کے بعد فرار ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، تو اس نے اپنی آخری گولی اپنی زندگی کو

امر کرنے کے لیے چُنا۔

شہید ضیاء الرحمان عرف دلجان ایک گوریلا انقلابی اور محنتی تھے۔انہوں نے شہادت کا بلند مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرائض انجام دیتے ہوئے حاصل کیا،آپ کے حوصلے بہت بلند تھے،اپنی جان وطن پر نچھاور کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی دھرتی اور اپنے خاندان کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔وہ ایک عظیم بیٹا،ایک عظیم لیڈر،ایک عظیم کمانڈر اور ایک عظیم دوست تھا۔آپ تو ہم سے جسمانی طور پر الگ ہوئے،پر آپکی سوچ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

19 فروری 2018 شہید دلجان اپنے دوستوں سے حال حوال کے لیے نیٹورک پر آیا تھا جب دشمن فوج نے انکو گھیرے میں لے لیا۔تین گھنٹے تک جھڑپ ہونے اور گولیاں ختم ہونے کے بعد شہید نے اپنی آخری گولی سے خود کو مار دیا۔

اسی طرح پھلین شہید امیر الملک،شہید عرفان جان،شہید امتیاز جان،شہید بارگ جان اور شہید دلجان (ٹک تیر) نے اپنے بندوق کی آخری گولی اپنے حلق میں اتار دی اور اپنے حلق کو چیر کر تنظیمی رازوں کو راز میں رکھا۔

سچائی یہ کہ ہم نے بہت کچھ کر دکھایا اور آگے بھی کرینگے ہم انصاف پانے کے لئے لڑتے رہیں گے،مرتے دم تک آخری گولی تک اب سے سب کو اپنا اپنا راستہ چننا ہوگا۔اس راستے پہ چلنا آسان نہیں،مشکل ہے پر ناممکن نہیں۔جب تم اپنے ملک کے لیے لڑتے ہو تو تم اپنے آنے والی نسل کے لیے لڑتے ہو اور یہ اپنی ذات سے نکل کر آنے والی نسلوں کی لڑائی لڑنا سب سے مقدس اور سب سے معتبر لڑائی ہے،جو ہر زمان و مکاں میں آزمائش کے کسوٹی پر بس حق اور جائز پر آ کر ہی رکا ہے اور فتحیات ہوا ہے۔

☆☆☆

وطن زادے

تحریر: فریدہ بلوچ
(ہمشیرہِ، ضیاء دلجان بلوچ)

آخر دھرتی ماں سے کوئی اتنا پیار کیسے کر سکتا ہے کہ دھرتی ماں کی ہر آواز پر جان نچھاور کرنے کیلئے پہل کرنے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہنا یقیناً یہ عشق کی انتہاء ہی ہے، جو زندگی جیسے عزیز شئے کو قربان کرنے سے بھی نہیں کتراتا، زندگی کو قربان کرنے کیلئے دوڑتا ہے نگر نگر پہاڑ، صحرا، ریگستان، میدان شہر گاؤں وہ چلتا رہتا ہے۔ ایک نڈر بہادر انسان کا فلسفہ حیات اسکی زندگی کا مقصد اور اسکے وجود کا ہدف و نصب العین زندہ رہنے کے تصور سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اگر اسے اپنی حیات کے عظیم مقصد کے حصول کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی زندگی قربان کرنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

عشق ہی ہے جس نے دلجان جیسے ایک بہادر فرزند کو اپنی گود میں پال کر بڑا کیا، عشق کے جذبات تھے جو ابھرے تو آخری گولی تک لڑتے رہے، وطن محبوب تھا انکو، وطن اسکی لیلیٰ اور وہ وطن کا مجنون تھا، پتہ نہیں وہ کب سے وطن کے عشق میں اتنا گرفتار ہو چکا تھا اور عشق ایسا کہ جسکا کوئی ثانی نہیں، جسکی کی کوئی مثال ہی نہیں بس وعدہ ہے کے تیری راہوں پر لہو کے آخری قطرے سانسوں کی آخری لڑی تک نچھاور کرینگے، دلجان نے وطن کی چاہ میں وعدہ نبھا کر آخری گولی بھی اپنے حلق میں اتار دی۔ تشدد کے بدلے تشدد کے فلسفے پر یقین رکھنے والا دلجان سیاسی اسٹیج سے جنگ کی طرف اس لئے گیا تھا کہ جنگ ہی وہ راستہ تھا جس میں منزل دکھائی دینے لگی تھی، جہاں وطن کے باسیوں پر توپ و بم کے انبار لگا ہو، جہاں قوم و وطن پر ظلم کا بازار گرم ہو وہاں دلجان جیسے زمین زادے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مخلصی، ایمانداری، بے غرضی، قوم و وطن سے محبت اور اپنی بہادری سے اپنے

مادروطن کے لیےلڑتے ہیں یہ لوگ سرزمین کے عشق میں جان کی بھی پرواہنیں کرتے، انکے لئے سخت وکھٹن راستے کا انتخاب پرکشش ہوتا ہے، تپتی گرمی ہو یا پھرسردیوں کی ٹھٹھرتی راتیں بس ہمت، محنت، لگن کے ساتھ بڑھنے کا حوصلہ ہوتا ہے، حوصلے ایسے مضبوط بولان کے پہاڑوں سے بھی زیادہ اور بلند ایسے کہ انکے سامنے چلتن، آماچ بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہی تو انتہا عشق ہے جو سرزمین کی محبت میں سب کچھ کرگزرنے کا حوصلہ بخشتا ہے جہاں زندگی کی تمام راہیں مسدود کی جائیں، علم وفہم کو آپ کی پہنچ سے دور کیا جائے، زندگی کی تمام سہولتیں چھین لیے جائیں، لکھنے پڑھنے حتی کہ سوچنے پر بھی دشمن کے پہرے ہوں، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو روشنی کے امکانات کم دکھائی دینے لگیں اور کوئی راہ باقی نہ رہے، وہاں بغاوت راہ نجات ہے اور اسی راستے کا انتخاب دلجان نے کیا اور بھلا ایسے راستے کا انتخاب دل جان کیوں نہ کرتا جسکو ماں نے پیدا ہوتے ہی کٹ مرنے کی لوریاں سنائی ہو، جسکی جوانی بندوقوں کے سائے تلے گذری ہو، وہ بھلا ظلم کے آگے کہاں جھکتے ہیں، جنگ جنکی مٹھی میں ہو، بغاوت جنکی سرشت میں ہو، وہ جھکنے کی بجائے کٹنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لمہ وطن کو اپنے ایسے جانبازوں پرفخر ہوتا ہے جو آسائشوں سے بےغرض وطن پر مرمٹنے کو اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں اور یہی انقلابیوں کی تاریخ ہے۔

ایسے ہی وطن زادے رہتی دنیا تک یادرکھیں جاتے ہیں جو دوسروں کی خاطر سروں کا سودا لگا کر اس پر ہمت حوصلہ و بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھڑے رہتے ہیں۔

دلجان وہ تاریخ بن چکا ہے، جو رہتی دنیا تک رہے گا، وہ ہر مظلوم کی زبان بن کر اسے انقلابی نغمے سنائے گا، وہ ہر مظلوم کی آنکھ بن کر اپنے مادروطن کی خوبصورتی کو سمالے گا، وہ ہر مظلوم کا دل بن کر اپنے قوم وطن کے لئے دھڑکتا رہے گا، وہ حوصلہ بن کر زہری سے نکل کر حب، کوئٹہ پھر بولان سے پارود میں دشمن کو نیست کرتے ہوئے پھر سے زہری کے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیگا۔ دلجان جہاں سے چلا تھا کامیاب ہو کر وہیں فنا ہو گیا، اسی دشت گزان سے ننھے پیروں کے ساتھ اٹھتے گرتے جو سفر شروع کیا تھا، آگے

بڑھ کر چٹان بنا اور آج چلتن کے پہاڑی سے بھی اسے دشت گزان پر چٹان بنے دیکھا جا سکتا ہے۔

دلجان آتا رہے گا، دلجان لڑتا رہے گا، مظلوم کے شانہ بشانہ دشمن کے خلاف، دلجان لوریوں میں سنائی دیتا رہے گا، دلجان کوئل کی کُو میں آواز دیتا رہے گا، منزل کی جانب بڑھتے ہر مسافر کو کیونکہ دلجان سما رہا ہے، دلوں میں ۔کل جو اس سے انجان تھے مگر آج ہر زبان زدعام سے اس کی شہادت کے قصے سنائی دیتے ہیں اور پھر لوگ اس کی شہادت کی وجہ تلاش کرنے لگتے ہیں، یہی تلاش کرنے کا پیاس ہی انہیں ضیاء سے ملائے گا۔

ضیاء کا تلاش انہیں کس قدر وطن کی محبت میں مبتلا کر رکھے گا، وہ اس تلاش میں اپنے مظلوم قوم کی بزگی خواری کو دیکھیں گے، اپنی عزت اپنی دھرتی ماں کو سسکتا دیکھیں گے، فریب زدہ چہروں کو پہچان لینگے، خود کے پیروں میں زنجیروں کی کھنکھن سے بیزار ہو جائیں گے۔

ریحانوں کے دل میں دلجان کی محبت اور وطن کی چاہ میں ہنسی خوشی موت کو گلے لگاتے دیکھیں گے، اسی تلاش میں جب وہ ضیاء سے ملیں گے
تو وہ وطن زادے کہلائینگے۔

حئی وضیاء، میرے زیست کے آئینے

تحریر: سارین بلوچ

بہت سوچنے کے بعد آج قلم اٹھانے کی جرات حاصل ہوئی، اس قلم کو مجھے دل جان کے کُلو (پیغام) کے بعد اٹھانا چاہیئے تھا۔ میرے پاس الفاظ بہت کم ہیں، جو میں دلجان کی تعریف میں صفحے پر اتار سکوں۔ دلجان، ضیاء، ٹک تیر، شعبان، کمانڈر رجھالا وان ایک ایسے بہادر سپاہی نکلے جس کی وفاداری، وطن سے محبت ہماری سوچ سے بھی بڑھ کر تھی۔ دلجان وطن کے ایک ایسے بہادر اور سچے عاشق نکلے، جو آخری گولی تک دشمن سے لڑتا رہا اور دوستوں کے سارے راز اپنے سینے میں دفن کر کے چلا گیا۔

وہ کیسے نہ کرتا ان رازوں کو دفن، جن رازوں کے پیچھے وہ کئی خواریوں کے بعد بلوچستان کی آنے والی نسل کے ہاتھوں آزادی کی ایک ایسی جنگ تھما رہا تھا، جس کی ضرورت بلوچستان کے پیاسے نوجوانوں کو کئی سالوں سے تھا۔ اپنے کام، اپنے مقصد اور اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے ہی اس نے ایسا قدم اٹھایا۔ قوموں میں بہت کم ہی دلجان، بارگ، حئی، سمیع، امیر، شیہک، امتیاز اور عرفان جیسے بہادر بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔ جو اپنے آنے والی نسل میں شعور پیدا کرتے ہیں۔

آج میں خود کو جس مقام پر دیکھتی ہوں، جہاں ہمارے پاس ہمارے پیارے تو نہیں ہیں، مگر ان کی سوچ و فکر ہمارے ساتھ ہیں۔ شہیدوں نے اپنے لہو سے جو قربانیاں دی ہیں، تاریخ ان قربانیوں کو سنہرے الفاظ میں یاد رکھے گی۔

رسم ورواج کے پابندیوں تلے، شاید آج مجھ میں بھی سوچنے کی قوت نا ہوتی۔ شاید میں بھی اپنی ذات کی حد تک سوچتی، میر معتبروں کی طرح آج میں بھی یہی سوچ کر چپ ہو جاتی کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور ہمیں کافر اسرائیل اور را کے ایجنٹ الگ کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم سچے مسلمان ہیں تو ہمیں پاکستان (جو کہ اسلام کے نام پر ایک دھبہ ہے) کے ساتھ رہنا چاہیئے، یہ وہ مسلمان ملک ہے، جہاں مسلمان خود کو مسلمان کہنے پر شرم محسوس کرتے ہیں۔

دلجان اس حقیقت کو تسلیم کر کے سیاسی اسٹیج سے لے کر پہاڑوں تک بلوچ قوم کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے جدو جہد کرتا رہا، بلکہ وہ دشمن پر حملہ کرنے کے ساتھ ساتھ قلم کے ذریعے بھی لوگوں میں شعور پیدا کرتا رہا۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بلوچ قوم کے نوجوانوں کو احساس دلایا کہ یہ وطن ہمارا ہے اور اس کے وارث ہم ہی ہیں۔

دل جان نے صرف ایک ہی مقصد کے لیے اپنے ماں باپ، بہن بھائی اور بچوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کا رخ کیا۔ وہ مقصد بلوچستان کی آزادی بابت لوگوں میں شعور پیدا کرنا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا اور آج بھی اس کے بعد اسکا کارواں اور اسکی سوچ زندہ ہے۔

دل جان ایک نہ مٹنے والا ہستی ہے، جسے دشمن چاہ کر بھی نہ مٹا سکا، دلجان نے ہمیں سوچنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی قوت دی، دل جان نے ہمیں سکھایا کہ اپنے حق کے لیے کیسے لڑا جائے۔ اپنے مقصد پر کیسے ڈٹے رہنا چاہیئے۔ کیسے ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے قبول کر کے اپنے مشن، اپنے مقصد کو آگے بڑھا کر اپنے وطن کو حقیقی امن کا گہوارہ بنا کر اپنے لوگوں کو آزادی کی زندگی سے آشنا کیا جا سکے۔

دلجان کا مقصد صرف بلوچستان اور اس میں بسنے والے لوگوں کو غلامی سے نجات دلانا اور انہیں ایک آزاد قوم کی

حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا، ایک ایسا وطن جہاں بلوچ قوم کیا، اس میں بسنے والا ہر جاندار خواہ وہ جانور کی شکل میں ہو یا پرند و چرند کی شکل میں، یہاں چلتی ہوئی ہوائیں ہوں یا یہاں بہتی ہوئی ندیاں وہ ہر ایک کی آزادی کا خواہاں رہا۔ وہ ہمیں غلام کی غلامی، سرکاری اان کے پالے ہوئے غداروں سے، معصوم بے گناہوں کو دشمن کی ظلم سے، مذہب کے ٹھیکیداروں سے، چور لٹیروں سے نجات دلانا چاہتا تھا۔

دلجان سے میری ملاقات بہت کم ہوئی تھی بلکہ یوں کہوں کہ وہ ملاقات ملاقات ہی نہیں جس میں دو لوگ آپس میں گفتگو بھی نہ کر سکے ہوں، میں اس ملاقات میں صرف دلجان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی، یہ میری خوش نصیبی تھی کہ دل جان سے ایک بار ملاقات تو ہوگئی، مگر میری بدنصیبی یہ کہ یہ میری ان سے آخری ملاقات بھی ثابت ہوئی۔ اس دن کے بعد نہ میں دلجان سے مل سکی، نہ بات کر سکی۔

سالوں بعد جب سوشل میڈیا کے ذریعے دل جان سے بات ہوئی تو وہ ہمیں ہمیشہ ہمیں فرض نبھانے کو کہتا تھا، جب ہم سب گروپ میں اکھٹے ہو کر ہنسی مذاق کرتے تھے، تو وہ یہ کہہ کر سب کو مخاطب کرتے کہ " کچھ اور کام بھی کرو، ہر وقت مذاق مستی میں وقت ضائع کرتے ہو۔"

دل جان کو پریشانی ہمارے مذاق ہمارے ہنسنے سے نہ تھی، مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم بھی وہی کریں، جس پر وہ سالوں سے عمل کرتا رہا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم بہنیں بھی اپنا کردار ادا کریں، وہ چاہتے تھے کہ سوشل میڈیا پر ہم کام کریں، اپنے اردگرد اپنے لوگوں میں شعوری بیداری لانے پر کام کریں۔

دلجان سے ملاقات کے بعد مجھے صرف اس کی مسکراہٹ، اسکی وہ میٹھی گفتار، وہ کچاری جو وہ اور حئی و باقی دوستوں کے ساتھ کر رہے تھے، جن کی باتوں کو میں خاموشی سے سنتی رہی، حئی وضیا میری زیست کے دو آئینے جن سے ہو کر زندگی گذرتی ہے۔ جن کے اپنے پن، دوستانہ مزاج و ایک دوسرے کے ساتھ ایک قول پر ڈٹے رہ کر اپنی

جان تک سے گذر جانا، اسی فلسفے نے انہیں ہماری آنکھوں میں جگہ دی، اسی فلسفے نے انہیں ہمارے دلوں میں زندہ رکھا۔

ضیاء اور حئی رشتہ دار ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے سب سے قریبی سنگت، ایک عمر میں بڑا تھا تو ایک ہنر میں۔ حئی کے کردار وعمل کی وجہ سے ضیاء کے نزدیک اسکی قدر کسی اعلیٰ مقام پر رہا اور عمرو سنگتی کے بنا پر ضیاء کسی قدر حئی میں سما چکا تھا، وہ کئی سالوں سے ایک دوسرے کے راز دار و سنگت رہے۔ شہر، پھر شہر سے پہاڑوں میں ایک ساتھ یک مشت ہو کر ایک دوسرے کا سنگت بن کر اپنے کام و تنظیم کو مضبوط بنانے کے لیے ہر سمت کام کرنے کو نکل پڑیں۔ جس دن حئی دلجان سے جدا ہو گیا ہوگا، تو سنگت کی جدائی نے کس قدر آگ بر پا کیا ہوگا اسکے دل میں۔۔۔ یہ تو بس دلجان کو ہی بخوبی معلوم ہوگا۔

حئی سمیت دوسرے سنگتوں کا غم لیے اسی راہ پر چلتا دلجان اپنی جہد، محنت اور خلوص سے، اپنے سنگت حئی کو پھر سے اس نے پالیا، نئے نئے ساتھیوں کی شکل میں۔ دلجان نئے ساتھی پیدا کر کے کارواں کو حئی جیسے نڈر ساتھی دیتا رہا اور دشمن کو دکھاتا رہا کہ بلوچستان کے بیٹے ایسے بزدل نہیں، جو تمہاری ایک گولی کی آواز سن کر تمہارے قدموں میں اپنے ہتھیار پھینک دیں بلکہ ایسا سوچنا بھی اپنے لیے گناہ سمجھتے تھے۔

دلجان اپنے مقصد و مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے، ہر ایک ورنا و بزرگ سے ملتا رہا۔ وہ سیاسی ذہانت کی بنا پر کسی سے بھی اس کی خواہش کے مطابق بات شروع کر کے، اپنے اصل ہدف پر لاتا اور جب وہ بھانپ لیتا، تب اسے کام سونپ دیتا۔ وہ ہر ایک کو ایک ہی کام کروانے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ سنگتوں سے وہی کام کرنے کو کہتا جس میں آنے والے سنگت خود کو پرفیکٹ سمجھتا یا جس کا ہنر رکھتا تھا۔

اپنی آخری گولی تک دل جان و بارگ دشمن سے لڑتے رہے اور دشمن کو بتادیا کہ یہ جنگ ایک آزادی کی جنگ

ہے، جو کئی سالوں سے چل رہی ہے اور جب تک ہماری آخری سانس ہے ہم بلوچستان کی آزادی تک اور آخری تیر تک لڑتے رہیں گے۔ آج ہمارے درمیان دلجان و بارگ تو نہیں ہیں، مگر جو سوچ انہوں نے آنے والی نسل کو دی۔ جو ہتھیار اور قلم انہوں نے آنے والی نسل کے ہاتھوں میں تھما دی، اسکے ذریعے ہمیں دشمن کو بتا دینا ہے کہ دلجان و بارگ آج بھی زندہ ہیں۔

زہری سمیت بلوچستان بھر کے نوجوانوں کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ جن شہیدوں نے ہمارے کل کے لیے اپنے آج کو قربان کیا، جس عظیم مقصد کے لیے انہوں نے پہاڑوں کا رخ کیا، یہ سب انہوں نے بلوچ قوم کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے کیا۔ تو آج یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان کے اس کاروان کو آگے لے جائیں، یہ عہد کر کے چلیں کہ ہم بھی آخری گولی تک دشمن سے لڑیں گے اس وطن کی آزادی تک لڑتے رہیں گے۔

دلجان: ایک حقیقی گوریلہ کمانڈر

تحریر: سفر خان بلوچ

جنگ بھی ایک ہنر ہے اور ہر کوئی اس کا ماہر نہیں ہوسکتا۔ جنگوں میں پھر گوریلہ جنگ بالکل الگ اور منفرد ہے۔ اس جنگ میں قوت سے زیادہ قابلیت اور عقل معنی رکھتا ہے۔ کب، کہاں، کس طرح اور کیسے حملہ کرنا ہے ان چیزوں کو سمجھنا ایک گوریلہ رہنما کے لئے اولین شرط ہے۔ بلوچستان میں بھی پاکستانی فوج کے ساتھ ہماری ایک گوریلہ جنگ چل رہی ہے جو کئی سالوں سے جاری ہے۔ اس جنگ میں ہمیں بے شمار گوریلہ کمانڈران ملیں جو ریاست کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ان ہی لاتعدد کمانڈروں سے کچھ کہ ساتھ خوش قسمتی سے میرا واسطہ رہا ہے۔ شہید ضیاء عرف دلجان اُن ہی میں سے ایک تھا۔

شہید دلجان کا سفر جہدِ آجوئی میں کافی طویل ہے۔ اُس نے سیاسی جدوجہد کا آغاز بی ایس او کے پلیٹ فارم سے شروع کی۔ اُس کے بعد مسلح جدوجہد کا آغاز بی ایل اے کے پلیٹ فارم سے کیا۔ وہ ایک سپاہی سے کمانڈر بننے تک کافی مشکلات سے گذر کر پہنچا تھا۔ جس کے پیچھے کئی سالوں کا جنگی تجربہ اور کئی سالوں کا جتن شامل تھا۔ سنگت دلجان کو معلوم تھا کہ دشمن کو کیسے شکست دی جاسکتی ہے۔ تب ہی تو وہ ایک ایسے وقت میں جھالاوان کا کمان سنبھالتا ہے، جب دشمن کا دہشت گھر گھر میں چھایا ہوا تھا۔

سنگت دلجان ہمیشہ کہتا تھا کہ یہ جنگ شہروں کا ہے، پہاڑ صرف ہمارے ''بیس'' ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ شہر میں اگر ایک کام ہو وہ پہاڑوں میں کی گئی کئی کاموں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اسی لئے دلجان اور اُس کے دیگر ہمراہ شہری کاروائیوں پر توجہ دیتے تھے۔ دلجان جنگ ایک منفرد حکمت عملی کے ساتھ لڑتا تھا، جسکی وجہ سے اُس نے کافی

کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ عوامی رابطے کو تحریک کی بقا سے تشبیہ دیتا تھا۔

پچھلے ایک سال سے دلجان اپنی محنت اور کامیاب کاروائیوں کی بدولت بی ایل اے کا ایک اہم کمانڈر ثابت ہوا۔ وہ زہری جیسے علاقہ میں گشت کرتا رہتا تھا اور نوجوانوں کو اپنے ہمراہ کر رہا تھا۔ دلجان اور بی ایل ایف کے ساتھیوں نے مل کر ایک بار پھر سے جھالاوان کو نیند سے بیدار کر دیا۔ یہ دوست اب کی بار مختلف انداز سے چیزوں کو آگے لے جا رہے تھے جو کہ قابل تعریف ہے۔ دلجان اور دوسرے دوستوں کی بدولت آج کئی دلجان اور بارگ اُن کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار ہیں۔

شہید دلجان روایتی جنگی طریقہ کاروں سے بالکل الگ کام کرتا تھا۔ انہوں نے بی ایل ایف کے دوستوں سے مل کر غیر اعلانیہ ریجنل کونسل بنایا تھا، جہاں دونوں تنظیموں کے علاقائی ذمہ دار صلاح مشورہ سے حکمت عملی مرتب کرتے تھے۔ دلجان، بارگ جان سمیت دوسرے دوستوں نے اپنے ریجن میں تمام معاملات کو ایک ادارے کی شکل دے دی۔ جس کی وجہ سے دشمن کو اُن کو سمجھنے اور روکنے میں کافی ناکامی ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست سمیت کچھ قبائلی سرداروں کے لئے وہ دردِ سر بن گئے تھے۔ آج انہی دوستوں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ اب سرادروں سے لوگوں کا خوف ختم ہو چکا ہے، اُن کی امیدیں بلوچ قومی فوج یعنی بی ایل اے اور بی ایل ایف پر ہیں۔

ایک بڑے عرصہ کے بعد زہری میں لمہ وطن کے جانبازوں نے قبضہ گیر سے دوبدو لڑائی کی تھی۔ شہدائے تراسانی نے دشمن کو کافی نقصان پہنچایا، جس کی شاہد وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔ تراسانی کے پہاڑوں میں ٹکرائے دلجان اور بارگ کے گولیوں کی گونج نے زہری کو نیند سے ضرور جگایا ہوگا۔ دلجان اور بارگ کے بارے میں کہتے ہیں کہ دشمن سے لڑتے لڑتے وہ کافی حد تک اُن کے گھیرے سے نکل چکے تھے، کاش کہ اُن کی بندوقوں میں کچھ اور گولیاں دشمن کے لئے ہوتے، شاہد ہمارے دو کمانڈر آج ہمارے ساتھ ہوتے اور ایک نئے مشن پر جانے کے لئے بحث کر رہے ہوتے۔

شہید دلجان آخری سانس تک ایک گوریلہ رہنما بن کر دشمن پر برستا رہا اور آخر کار اپنے ہمراہ شہید بارگ کے ساتھ مل کر خود کو ہمیشہ کے لئے امر کر گیا۔ وہ مرنے کو قومی رازوں سے زیادہ اہمیت دے گئے۔ یہ کیسے لوگ ہوتے ہیں، جو موت کو خود ہی چُنتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ کہ ''مرنے کا اختیار کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ وہ میرا خود کا فیصلہ ہوگا'' بیشک بہت کم لوگ یہ اختیار خود چنتے ہیں اور وہ لوگ عظیم ہوتے ہیں۔

آج شہید دلجان اور بارگ جان ہمارے ساتھ جسمانی طور پر نہیں۔ لیکن اُن کا مقصد اُن کی محنت جس کی بدولت ہزاروں جہدکار آج دشمن سے لڑنے کے لئے تیار ہیں، اُن کی شکل میں ہمارے بیچ موجود ہیں۔ ہم شہدائے تراسانی سے وعدہ کرتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے آپ نکلے تھے، وہ مقصد انشااللہ ہم ضرور پورا کرینگے۔

دلجان سنگت آپ سے وعدہ ہے، ہم جھالاوان کو اب پھر سے سونے نہیں دینگے۔ ہم دشمن پر ہزار دلجان اور بارگ جان بن کر برسینگے۔ ہمیں یقیناً آپ کے جانے سے صدمہ ہوا، پر ہم ہارے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کی بہادری اور لمہ وطن پر خوشی خوشی جان قربان کرنے کا اعلیٰ اور افضل عمل نے ہمیں مزید حوصلہ بخشا ہے، اب شکست دشمن کا مقدر ہے۔

دلجان

تحریر: زہرہ جہاں

19 فروری تاریخ کا وہ اندوہناک دن ہے، جس نے ہم سے تین وطن زادے شہزادے،، حق نواز، دلجان و بارگ چھینے ہیں۔ گوکہ وہ امر ہوئے ہیں۔

میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے قلم، ذہن وفہم کو وطن مادر کی مہر، حرمت و آزادی کی خاطر قربان ہونے والے مہرزادوں کے لیے وقف کردوں لیکن شہیدوں کے کردار پہ لکھنا ان کے اعلیٰ ظرفی کو لفظوں میں پرونا اور قربانیوں کو قلم سے سرخ رنگ دینا ہمیشہ ہی میرے لیے مشکل اور کٹھن کام رہا ہے۔

شہید تو ہوتے ہی عظیم ہیں، شہادت ہوتا ہی عظیم لوگوں کے لیے ہے۔ ان کی اڑان و پہنچ ہماری سوچ و تخیل سے کہیں اونچی اور کہیں آگے ہوتی ہے اس لیے ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے کردار پہ اپنے خیالات کی درشانی کے لیے عظیم لفظ ہی چھوٹا لگنے لگتا ہے۔

شہید حق نواز، بارگ اور دلجان تینوں ہی میرے وطن کے روشن چمکتے دمکتے ستارے ہیں لیکن یہاں میری تحریر کا مرکزی کردار ضیاء دلجان ہوگا کیونکہ میری معلومات شہید بارگ و شہید حق نواز کی نسبت دلجان کے بارے میں تھوڑی زیادہ ہیں۔

دلجان کو میں دلوں کی جان کہتی ہوں اور کیوں نہ کہوں، انہوں نے تو تحریک کو اپنی ضیاء سے منور کرتے کرتے

اپنے ساتھ تین اور نام کمائے تھے شعبان، ٹک تیر اور دلجان جواب تک کسی نے اپنے مقدر میں لکھے ہیں۔

اور وہ دلجان کیوں نہ بنتا جسے بہادری ولاڈ وراثت میں ملی تھی، بابو نوروز خان سے، جس نے ماں کی گود میں ''میں دھرتی کا ہوں'' ''لولی'' پڑھا تھا، جس نے چھوٹے بھائی راشد حسین کے ساتھ وطن پرستی کا کھیل کھیلا تھا، بچپن میں دوستی وسنگتی کے سنگم کو ہر حال میں برقرار رکھنے کا سبق جس نے شہید حق نواز سے پڑھا تھا، دشمن کے ساتھ زندہ جانے کے بجائے آخری گولی کا مشق جس نے شہید امیر جان کے ساتھ کیا تھا، ہنسی ومسکراہٹ کے قہقہے جس نے نثار صباء کے ساتھ لگائے تھے، سیاہ چاہ کے پیالے میں جس نے حیو نثار کے ساتھ دنیا کی فکر کو دھوئیں میں اڑایا تھا۔ جس نے شہید محترم کے ساتھ دشمن کی نیندیں اڑادیں تھی جس نے شہید چیئرمین فتح قمبرانی کے ساتھ گوریلا جنگیں لڑی تھیں جس نے مرید بلوچ کے ساتھ وطن کے لیے نغمے لکھے تھے جس نے استاد میر احمد کے ساتھ وطن کے گیت گائے تھے . جسے کامریڈ عبدالنبی نے اپنے تجربے سے بہرآور کیا تھا جس نے شہید استاد جنرل اسلم کے کمان میں جنگ کے اصول سیکھے تھے۔

وہ بندہ دلجان کیوں نہ بنتا جسے بلوچ دھرتی نے اپنی خدمت کے لیے چنا تھا، جسے دھرتی نے اپنا فدائی بنایا تھا، جسے دھرتی نے اپنی مہر ومحبت کا سفیر بنایا تھا، جسے دھرتی نے اپنا شہہ مرید چنا تھا۔ جسے دھرتی نے اپنا حقیقی وارث ٹھہرایا تھا، جسے دھرتی نے اپنے نرمزار یعنی سرمچار کے شرف سے بخشا تھا، جسے دھرتی نے اپنے ساتھ مسکرانے کا موقع دیا تھا، جس کے ساتھ دھرتی تنہائی میں روتا تھا، جسے دھرتی نے اپنے نور کا ہمراہ بنایا تھا، جسے دھرتی نے اپنے گواڑخوں کا رکھوالا بنایا تھا، جسے دھرتی نے اپنے مٹی کا کماندار بنایا تھا۔۔۔

وہ بندہ تو بنا ہی دلوں کی جان بننے کے لیے تھا۔ وطن کی مہر ومحبت، یکجہتی واخوت، قربانی وشہادت اور آجوئی ہی عبادت کا پیکر تھا۔ 2007 سے لیکر 2018 تک اس پہ اور اس کے خاندان پہ انگنت مظالم ڈھائے گئے، جو اب تک جاری ہیں لیکن ضیاء نے اپنے دل پہ رکھے وطن کی پتھر کو کبھی بھی نیچے گرنے نہ دیا بلکہ اپنے آنے والی

نسل کو مزاحمت کا راستہ دکھایا۔ انہیں بندوق و قلم کا جوڑ سکھایا، انہیں دشمن کو ٹک کر کے مارنا سکھایا اور ٹک تیر کا لقب پایا۔ اپنے درد و غم، خواہشات و احساسات کو الفاظ میں پرونا سکھایا اور ضیاء کے ساتھ منور ہو گیا۔ دوستی نبھانے کا ہنر سکھانے کے لیے شعبان بن کر آیا۔ قریب و دور سب کے ساتھ مہر کا ایسا رشتہ تخلیق کیا کہ دلوں کی جان یعنی دلجان بن کے استعارہ بن گیا۔

شہید ضیاالرحمٰن

تحریر: دوستین لاسی

ضیاالرحمٰن عرف دلجان مجھے معاف کرنا میں نے تجھے پہچاننے میں دیر کردی اور اب حب چوکی کی گلیوں الہ آباد کے گراؤنڈ کے آس پاس تجھ سے ملاقات نہیں ہوگی، مگر لسبیلہ خوش قسمت ہے، حب چوکی خوش قسمت ہے کہ آپ یہاں جوان ہوئے، حب کی گلیاں تجھے یاد کررہی ہیں، میری طرح اور کئی لوگ تجھے یاد کررہے ہیں۔

20 فروری کی صبح موبائل ڈیٹا آن کیا فیس بک دیکھ رہا تھا کہ آپ کی تصویر سامنے گذرا مگر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اپنا حب چوکی کا ضیاالرحمٰن ہے میں اچانک چونک گیا کہ بلوچستان کا مشہور جہد کار ٹک تیر ضیاالرحمٰن زہری تھا لیکن ہماری بدقسمتی دیکھو کہ ضیاالرحمٰن یہاں سپر دگلز مین نہ ہوسکا شاید وہ ہم سے خفا تھا کہ لسبیلہ کے لوگ وطن سے محبت نہیں کرتے لیکن ضیاالرحمٰن ایسا ہرگز نہیں سوچتا ہے وہ عظیم سوچ کا مالک تھا، وہ علاقائی تعصب سے پاک وطن کا دیوانہ تھا۔ میں نے شہید جاوید نصیر، شہید صمد اور ضیاالرحمٰن سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن شہید ضیاالرحمان سے وہ باتیں سیکھیں کہ زندگی بھر مجھے حوصلہ دینگے۔

اگر شہید ضیاالرحمان سے ملاقات نہیں ہوتی تو میں آج کسی وطن دشمن پارٹی کا ممبر ہوتا، جام بھوتانی رجب یا لالہ مجید کا شیدائی ہوتا لیکن ضیاالرحمٰن اور بی ایس او کے سرکلز نے مجھے شعور دیا، ضیاالرحمان سے آخری ملاقات غالباً 4 سال پہلے ہوا، وہ جمعہ ہوٹل میں اب سر عام نہیں بیٹھتا تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ ضیاالرحمان اسٹیج اور جلسوں کی سیاست سے بہت دور نکل چکا ہے، چار سال بعد آج اسکی تصویر نے مجھے بہت بدل دیا

ضیاالرحمٰن ضرور لسبیلہ سوچے گی کیونکہ لسبیلہ بلوچستان سے آئے ہوئے مختلف قبائلوں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔

لسبیلہ کے مزدور، طالب علم، سیاسی کارکنوں کو میں یہ ضرور کہونگا کہ یہاں باہر سے آئے ہوئے پنجابی اور دیگر سرمایہ دار پچھلے دس بارسالوں سے ہمیں اس لیے 12 ہزار کی نوکری دیتے آرہے ہیں کہ ضیاالرحمان جیسے نوجوانوں کی بندوق نے ہمیں عزت بخشی ہے وگرنہ جام بھوتانی اور یہ پارلیمانی پارٹیوں نے ہمارا سودا کب کا کیا ہوا ہے، ورنہ ہمیں انسان تو کجا جانور سے بدتر جاہل سمجھتے ہیں۔

دل کہتا ہے بہت لکھوں ضیاالرحمٰن لیکن اب لکھنے کے ساتھ ساتھ آپکا عظیم پیغام عام کرونگا۔ مجھے یاد ہے 2011 کوڈگری کالج حب میں بی ایس او کے سرکل میں ایک دوست نے کہا کہ یہاں کے مقامی لوگ کبھی بھی جدوجہد میں شامل نہیں ہونگے۔
میں نے کہا آپ غلط ہو، اس نے کہا کہ میں دوسالوں سے ایک ہی لاسی ہوں جو سرکلوں میں آتا ہوں اور کیوں نہیں آتے؟ لہٰذا میں شاید اپنے کسی مفاد کے لئے سرکل میں بیٹھتا ہوں۔ میں اس دوست سے ناراض ہوکر سرکل سے اٹھ کر چلا گیا۔

پھر حب سے کئی دوست شہید ہوتے گئے اور ان میں عابد علی موٹک بھی شامل تھا، جو یہاں کا مقامی لاسی قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔
پھر 2013 میں اس دوست سے رابطہ ہوا اس نے کہا دوستین معاف کرنا یہ جدوجہد ہم سب کا ہے، اس قوم کا مکرانی، مینگل، زہری مری، بگٹی، رونجھہ موندرہ سب کا ہے۔

اپنی باتوں کو یہاں ختم کرنے سے پہلے اتنا کہونگا اب حالات بدل چکے ہیں اب وہ سرکلز اور دیوان اوپن نہیں ہو سکتے آج میرے پاس کوئی بندوق بردار بھی نہیں لیکن کل میں ایک موندرہ تھا آج میرے ہم فکر کالج کے کئی دوست ہیں اور ہم سب دوست مل کر شہید ضیاالرحمان کا پیغام لسبیلہ میں عام کرینگے۔

☆☆☆

فکری ونظریاتی رشتوں کالاج، دلجان بلوچ

تحریر: جلال بلوچ

(نوٹ: بی ایل ایل کے مجید بریگیڈ کے فدائی شہید رازق بلوچ، جلال بلوچ کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔)

اکثر تحریروں کے آغاز میں یہ الفاظ بہت زیادہ پڑھنے کو ملتے ہیں کہ کہاں سے شروع کروں؟ کیا لکھوں،؟ لیکن یہاں بات کچھ اور ہے تحریر شروع کرنے سے پہلے ہم جیسے طالب علموں کیلئے تحریر کس پر لکھا جارہا ہے پہلے یہ جاننا بہت ضروری ہے کیوں کہ تحریر دلجان جیسے فرزندوں کے نام سے شروع ہوں تو یہ جاننا چاہیے کہ دلجان جس کا نام خود ایک پہچان اور دلجان خود ایک فکر! دلجان ایسا کرو، دلجان ویسا کرو، ارے یار روٹی پکاؤنا، یار دیگ سنبھالو۔۔۔۔ یہ وہ الفاظ تھے جو میں نے دلو سے ملتے وقت سنے تھے۔

دلجان سے پہلی ملاقات کے وقت یہ الفاظ میرے کانوں میں خوب پڑے آخر تنگ ہوکر پیچھے دیکھنے پر مجبور ہوا۔ ایک نارمل قد، مسکراتا ہوا چہرہ، اور لمبے لمبے گھنے بال۔ ارے یار کیا ہوا آپ لوگوں کو، میں آدمی ہوں مشین نہیں، کیسے کام کروں، کس کو بڑھائی دوں۔ دراصل دوست دلجان کو چھیڑ رہے تھے۔ کیونکہ وہ خود دوسروں کو خوب تنگ کرتا تھا۔ ایک دن سب دوستوں نے ایک پروگرام بنایا کہ آج دلجان کو خوب چھیڑنا ہے۔ اس لیے سب دوست دلجان کو اپنی طرف بلا رہے تھے کہ دلجان کو خوب تنگ کر کے خوب لطف اٹھایا جائے کیونکہ دلجان خوش مزاج اور خوب مجلس کرنے والے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔

بے انتہا مہر ومحبت سے بھرا ہوا دلوں کے سرتاج دلجان سے پہلی ملاقات غالباً 2013 میں اس وقت ہوا جب مجھ جیسا ناچیز پاکستانی بربریت سے جان بچانے بی ایل اے کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ اس کو میں اپنی خوش قسمتی

سمجھوں یا کے بدقسمتی مجھے خود سمجھنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔

دلجان سے بہت سے موضوعات پر بات چیت ہوتا تھا، جس میں دلوا ایسے دلائل سامنے پیش کرتا تھا کہ آگے سوال کرنے کی ہمت ہی ختم ہو جاتا۔ کیونکہ جواب اتنا اطمینان بخش ہوتا جو دماغ میں آنے والے سوالوں کا بھی جواب ہوتا۔ میرے خیال سے دلو سیاسی وعلمی دانشمندی کا ایک جیتا جاگتا مثال تھا۔

2015 میں جب قلاتی مری کے سرینڈر ہونے کی خبر آئی، تو میں کچھ عجیب حرکات کر رہا تھا مجلسوں میں نا بیٹھنا اور اگر آ بھی جاتا تو بہت پریشان خود سے جستجو میں مگن رہتا۔ کچھ عجیب سا محسوس کر کے دلو نے ہمت جتا کر مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی ''یار کیا بات ہے آپ پریشان لگ رہے ہو، میں تین دنوں سے محسوس کر رہا ہوں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ گھر میں سب خیر خیریت ہے؟'' دلو مجھ سے پوچھنے لگا۔۔۔

''ہاں! یار سب کچھ ٹھیک ہے مگر میں سوچ رہا تھا قلاتی خان جیسا فراری 45 سال جدوجہد کر کے سرینڈر کر رہا ہے۔ یہ کیا سوچ کر سرینڈر کر رہا تھا۔ وجہ کیا ہے کے اتنے سینئر فراری سرینڈر کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اگر یہ 45 سال جہد میں رہ کر سرینڈر کر لیتا ہے۔ تو میرا اور تمہارا یا ہم سب کا کیا ہوگا۔ جو آزادی کے جہد میں طفل کے مانند ہیں۔''
دل جان ہلکی سی مسکراہٹ لیکر کہنے لگا'' ارے یار آپ اتنی سی بات کیلئے اتنے پریشان ہو چلے تھے۔ قربان کروں قلاتی جیسے لعنتی کو جس کی وجہ سے آپ پریشانی میں مبتلا ہو۔''

میری بات کو متوجہ ہو کر غور سے سنو اور اپنے دل ودماغ میں یہ بات ذرا اندر ٹھونس دو یہ ایک قلاتی خان ہے جو سرنڈر جیسے لعنت کو 45 سال جہد سے وابستہ رہتے ہوئے آخر کار شرمندگی کی زہر کو گلے سے اتار دیا، پتہ ہے اصل وجہ کیا ہے۔ ایک تو ہماری آپس کی رسّہ کشی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ہر چار سال بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار بن

رہے ہیں۔ دوسرا نظریہ وفکری بنیادوں کے بغیر جہد میں رہنا ایک ایسی بیماری ہے جو اچانک ابھر کر پورے جسم کو ناکارا بنادیتا ہے۔ یہ قلاتی خان اسی طرح کی بیماری میں مبتلا ہوا ہوگا۔ جو آج اس کے وجود پر لعنت بن کر اسے ناکارہ بنا چکا ہے۔نظریے کے بغیر بندوق کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ میں اسے بے لگام جانور سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔

دل جان آپ سے اتنا قریب بھی نہیں رہا نا کہ دور رہا، آج بھی جب سانسیں چل رہی ہیں تو سانسوں میں آپکے نظریہ سے بھرپور مہر خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ وہ پل میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا جو ہر صبح نیٹ ورک کی ذمہ داری کندھوں پر لیے ہوئے بھوکے تین گھنٹے سفر پر حال احوال کیلئے جاتے تھے آپ۔ جو شام ڈھلتے ہی واپس آجاتے تھے۔جس کی گواہی آپکا لاغر بدن خود دے رہا تھا۔ جو مسلسل دو سالوں تک دن کے کھانے سے محروم رہا تھا۔

میری زندگی میں بغاوت پہلے سے تھا مگر اس بغاوت کو فکری شعور ایک امیر جان اور ایک دلجان نے دی۔ میرے دل و دماغ میں نظریہ اور فکری بندھن اور اپنے لیے فوقیت کی ایک کتاب چھاپ کے رکھ دی ہے۔

ہم ضد پر اڑے ہوئے ہیں دیکھتے ہیں پہاڑ ٹوٹے گا یا سر۔ دلو آپکا آخری میسج خود دشمن کے لیے شکست کا زوردار طمانچہ ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنی ضد جو کہ میں غلامی کی ایک علامت قرار دیتا ہوں۔ وہ ضد اپنوں کے لیے نہیں بلکہ دشمن کے لئے تھا۔ یہ تھا انقلاب اور یہ تھا انقلابی عمل۔

☆☆☆

میرا قلم، دلجان

تحریر:علیزہ بلوچ

پہلی بار کچھ لکھنے کی کوشش کررہی ہوں، اس دوست کی محبت میں، جسے میں ذاتی طور پر تو نہیں جانتی تھی، مگر کبھی شعبان، تو کبھی برزین نام سے ایک سنجیدہ اور وطن دوست کی صورت میں دیکھ چکی ہوں۔ کچھ وقت پہلے ہی، ان سے میرا احساس، نظریے، سوچ اور فکر کا رشتہ بنا تھا۔ جو مجھ سمیت میرے دو تین دوسرے دوستوں کو ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ بس فضول میں اپنا وقت برباد کرتے رہتے ہو، کبھی کچھ نہیں ہوگا تم لوگوں سے اس طرح، کبھی تو کام کی بات کیا کرو، کبھی تو لکھوا پنے خیالات کو، اپنے لوگوں سے بات کروان سے تعلقات بناؤ، اُنہیں جہد کی راہ پر لاؤ۔ آزادی کے سفر میں جو بے قراری، جو شعور، جو مشعل انقلاب کی چنگاری لیکر دلجان چل رہا تھا، وہ اگر چاہتا تو ہمارے سروں میں کیل ٹھونک کر ہمیں احساس دلاتا لیکن وہ دلجان مہربان بھلے وہ دشمن کے لیے آگ سے کم نہ تھا، پر ہم دوستوں کیلئے مہر سے بھرپور تھا وہ ہمیشہ ہنسی مذاق میں ہی ہمیں درس دیتا رہا، سمجھاتا رہا کہ ہمارا کام کیا ہے۔

کاش! آج وہ یہ دیکھ پاتا کہ مجھ جیسے نالائق نے بھی ان کی محبت میں لکھنا شروع کردیا، جس نے اِس سے پہلے کئی دوستوں کے بولنے پر، لاکھ کوششوں کے باوجود بھی کچھ لکھ نہ پائی۔ نجانے کیسا انسان تھا ضیاء، جس نے آج چلے جانے ک بعد مجھ میں یہ صلاحیت پیدا کردی، کچھ تو جادو جیسا ہے۔ شاید اسکا دوستانہ لہجہ یا مہربان باتیں، وہ ہر کسی سے اس کی طبیعت کے مطابق بات کرنے کا ہنر رکھتا تھا۔

19 فروری کی شام کو جب وہ شہید ہوئے تھے، تو بہت سے دوستوں کے dp سیاہ تھے اور تقریباً بہت سے دوستوں کے ٹائم لائن پہ'' آہ دلو'' لکھا ہوا دیکھا میں نے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا، تبھی ایک نیوز پہ نظر پڑی

جس میں لکھا تھا کہ ''نورالحق عرف بارگ اور ضیاء الرحمٰن عرف دلجان نے دشمن سے تین گھنٹے کے مقابلے کے بعد خود کو شہید کر دیا ہے۔'' دلجان نام سے ذہن میں ایک آرٹیکل لکھنے والا دوست آیا، جسے میں صرف پڑھا کرتی تھی، وہ اکثر شہید سنگتوں کے متعلق لکھا کرتا تھا۔ پھر کنفرم کرنے کے لیے دوستوں سے پوچھا، تو انہوں نے بتایا کے دلجان وہی ہمارا سنگت شعبان ہی ہے، جو دشمن کو شکست دے کر وطن کی چاہ میں فنا ہوا، دماغ نے جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیا۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں، کاش کہ چند لمحے اور ان دوستوں کی شہادت کی خبر مجھ تک نہ پہنچ پاتی۔ کچھ لمحے کچھ ہی لمحے اوروں سے زیادہ میں خود کو ان کے بیچ محسوس کرتی، کاش! شہید شاہین کی شہادت کی خبر نہ سنتی، امید بندھی ہوتی کہ وہ آئے گا۔ کاش شہید جاوید، شہید محی الدین شہید، گزین شہید، بارگ، شہید نثار، شہید عبدالرسول، شہید حق نواز، شہید امیر الملک بلکہ کسی بھی بلوچ ماں کے بہادر بیٹے کی المناک جدائی کی خبر نہ سن پاتی۔ کاش! میرے اس سوال پر کہ دلجان کون ہے؟ کاش کہ اُس لمحے شعبان جواب دیتا مجھے کہ آپ اسے جانتی نہیں۔ کاش میں اس لمحے وہ سوال نہیں کرتی، تو کچھ لمحے معلوم نہ ہوتا کہ میرے مہربان سنگت شعبان زندگی کو ہرا کر ہم سے دور ایک کامیاب موت کو گلے لگا کر امر ہو گیا ہے۔

عجیب حالت تھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور بس اس کی محبت بھری ڈانٹ یاد آ رہے تھے اور کہہ رہا تھا فضول بیٹھنے سے کچھ کام کرو، آج پھر ہم نے اپنے دو عظیم دوست کھو دیئے، یا خدا! آخر کب تک ایسا ہوتا رہے گا، کب تک ہم اپنے عظیم بھائیوں کی قربانیاں دیتے رہیں گے۔؟

پھر سوچتی ہوں کہ وہی بھائی ہمارے درمیان سے اٹھ کر اپنے کام، محنت، مقصد میں لگے ہوتے ہیں اور اپنی اس قدر مخلصی محنت و خواری کا کبھی ہمیں احساس ہونے نہیں دیتے، وہ بس ہمیں سمجھانے، ہمیں راہ دیکھانے اور ہمارے مستقبل کے لیے رات دن اپنے کام میں مگن رہتے ہیں، اسی طرح میرا سنگت، میرا بھائی شعبان ہمیشہ

صبح سویرے آنلائن ہوتا، کسی کو خبر نہ تھی کہ کئی سالوں سے گھر سے دور وہ کس طرح کہاں کسی میدان، پہاڑ یا درخت کے نیچے رات گذار کر پھر دن بھر مسکراتے ہوئے ہر میسج کا اپنے ہی انداز میں جواب دیتا رہتا۔

سوشل میڈیا' یا پھر فیسبک پر میں ایک بلوچ بہن کی حیثیت سے کچھ سیکھنے آئی تھی، مگر یہاں عمر بھر کی وہ یادیں ملیں، جو زندگی جینے کا سلیقہ سِکھا جائیں۔ شہید طارق کے کاروان کے ساتھی ملیں، جنہوں نے زندگی کے اصل مقصد کو جان کر ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے، ایسے عظیم سنگتوں کی شہادت پر دشمن کیا سمجھتا ہے، اس طرح جسموں کو مٹانے سے وہ ہماری سوچ ہمارے نظریہ کو ختم کرے گا؟ کبھی نہیں، اس طرح ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر کے وہ ہمارے اندر انتقام کی آگ کو اور ہوا دے رہا ہے، وہ شاید یہ بھول چکا ہے کہ سونا آگ میں جل کر پیتل نہیں کندن بن جاتا ہے۔

میں ضیاء کے بارے میں اور تو کچھ نہیں جانتی تھی، مگر آج اُس کے بارے میں جان کر میں بہت فخر محسوس کرتی ہوں کہ میں بھی اُن کی دوست رہ چکی ہوں، جس کے زیادہ نہ سہی مگر تھوڑی سی قربت نے آج مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں کچھ لکھ پائی، بس اگر افسوس ہے تو اس بات کا کہ کاش میں ضیاء کی موجودگی میں ایسی ہمت کر پاتی، تو وہ مجھے ایسے دیکھ کر کتنا خوش ہوتا کہ میں نے اُن کی بات مان کر قلم اٹھالیا ہے مگر یہ پچھتاوا میں آگے کے دوستوں کے لیے نہیں رکھنا چاہتی ہوں، اس لیے آج سے مجھ سے جو کچھ بھی ہوگا، میں ضیاء، علی شیر، محی الدین، شاہین، حئی، گزو، نورالحق امیر الملک، طارق اور سلیمان جیسے تمام شہیدوں کے سپنوں کو پورا کرنے کے لیے کروں گی، جتنی امیدیں ضیاء کو مجھ سے تھیں میں پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔ یہ منزل یہ راستہ اس سے جڑے یہ احساس کے رشتے دشمن کے اذیتوں سے کئی گنا بڑھ کر ہیں۔

☆☆☆

ضیاء، گاؤں کی امید

تحریر: شہناز زہری

ایک گاؤں ہوا کرتا تھا، جہاں جہالت کے گھپ اندھیرے کا راج تھا، جہاں اس اندھیرے میں اسی کا سکہ چلتا، جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی تھی، جہاں لاچار اور لاچار ہوائیں چلتی تھی، مظلوم کی مظلومیت سسک سسک کر مرنے کی بھیک مانگ رہی تھی، جہاں نوجوان بھٹکتے راستوں پر گمنام ہو کر زندگی کے مردہ خانوں میں سج سنور کر موت سے بدتر زندگی جی کر بھی خاموشی اختیار کر بیٹھے تھے، جہاں بزرگ ٹوٹتے بیساکھیوں میں اپنی موت کا تصور ڈھونڈتے رہتے، مگر انہیں زندہ رہنا تھا کہ انکے رسم ورواج میں عورتیں لاشوں کو کاندھا نہیں دے سکتے تھے، جہاں حوا کی بیٹی کو بڑی ہونے پر سردار کی لونڈی یا پہرے دار کی غلامی قسمت کی لکیروں میں لیکر آتی تھی۔ جہاں نوجوانوں کو دین ودنیا سے زیادہ غلامی کا درس دیا جاتا رہا، جہاں رات دن سے زیادہ دلوں پر تاریکی بکھیر دیتا، سورج ڈوبتے ہی زندگی کے امید دم توڑ دیتی، دن کی روشنی میں موت چیخ چیخ کر لوگوں پر مسلط ہوا کرتا تھا، جہاں لوفر ولٹیروں کا راج ڈنکے کی چوٹ پر سر چڑھ کر بولتا تھا، جہاں نسلوں سے چکی میں پس پس کر پردادا سے دادا پھر دادا سے باپ اور پھر بیٹے تک ذہنوں پر برابر غلامی مسلط رہا تھا۔

اس گاؤں نے کئی دہائیوں اپنے اندر بسے انسانوں میں کبھی انسان جیسی شہ نہیں دیکھی تھی، کئی سالوں تک امید لگائے بیٹھی تھی کہ شمع کی روشنی کس سمت سے آئے گی، مگر امید لمحہ بہ لمحہ دم توڑتی جارہی تھی۔ نم آنکھیں آنسوؤں کے ختم ہونے پر لہو آنکھوں کے رستے ٹپکا کر انہیں خشک کر چکی تھی۔ اب وہ تنکا تنکا مرنے کی دہلیز پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے منتظر بس دیکھ رہی تھی اور دہشت وخونخوار بھیڑیا دن بہ دن لہو میں ڈبو کر لاشوں کو ان کی اصل شکل میں تبدیل کرتا جارہا تھا اور پھر بہت سارے لاش اکھٹے ہو کر گزشتہ شب کے لاش کو دفنا کر اگلے سحر گوشت

نوچنے میں لگے رہتے۔

اپنے سپوتوں کی اس بے حسی پر یہاں کی مٹی خود کو کوستی رہتی، کس قدر نالائق مٹی میری قسمت پر پڑی ہوئی ہے۔ جنہیں اپنی موت کے لمحے تک بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیوں اس غلامی کے دلدل میں دھنسے چلے جا رہے ہیں۔ ہر مرنے والا اپنے جیسے ہی کسی لاش کو قصوروار قرار دے کر اپنے اصل قاتل سے بھٹک جاتا تھا، اس قدر بے حرمت موت پر وہاں کے لوگوں کو عادت ہو چلا تھا، میدانی علاقوں میں قبرستانیں، چاردیواریوں میں نہیں ہوا کرتے، اس لیے انہیں کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں قبرستان بھر گیا ہوگا۔

مگر گاؤں اپنے سینے میں لاشوں کے ڈھیر کو محسوس کرتے کرتے خود دعا گو تھی کہ کبھی تو کوئی آ کر مجھے اس میں دفنا کر چلا جائے، کوئی تو میری لاش کو کسی سڑک کنارے کسی نہر سے کسی پہاڑی کے دامن سے وصول کر کے جنازہ ادا کر کے قبرستان کے کسی کونے میں دفنا کر چلا جائے، بلوچستان کے کئی علاقوں کی طرح میرا گاؤں زہری بھی موت کو نہ پانے والی بدنصیبوں میں سے ایک تھی۔

وہ روز خشک ترستی نگاہوں سے امید کو دم توڑتے دیکھ رہی تھی، وہ ان کے قریب خود میں بسے لوگوں کی طرح زندہ لاش ہی بن جاتی، اگر اس سحرا سے شاہموز کے پہاڑی سے ہمیل و بندوق کاندھے پر لٹکائے امید و حوصلہ کھڑا نہ ملتا۔

شاہموز کے پہاڑی پر مسکراتا کھڑا امید بوڑھی گاؤں کے دم توڑتی حالت کو نہ جانے کہاں سے محسوس کر کے صدیوں کا سفر طے کر کے یہاں پہنچا تھا، امید کو دیکھ کر اسکی حالت بتا رہی تھی کہ وہ ایک عشرے سے سویا نہیں تھا۔ اسکے پرانے جوتے بتا رہے تھے کہ کتنے منزلوں کا مسافر ہے۔

وہ شاہموز کے پہاڑی پر کھڑا مسکرا رہا تھا، تازہ دم بھرنے وہ ایک پتھر کے سرا ہنے پیٹھ ٹکا کر، ایک سرد آہ بھر کر دل ہی دل میں مطمئن تھا کہ وہ اس سرزمین پر پہنچ گیا، قریب ہی اسکی نظر گاؤں پر پڑی، جو شہید سفر خان کے قبر کے پاس لیٹی قریب المرگ تھی، امید اٹھ کر اسکے پاس جا بیٹھا، گاؤں امید کو اپنے سرہانے دیکھ کر اٹھ بیٹھی، جیسے ہی اس نے نظر اسکے مسکراتے چہرے کی طرف کی ایک خوشی کی لہر گاؤں کے لبو پر بکھرنے لگی، اس کے سامنے وہ مسیحا بیٹھا ہوا تھا، جسکا انتظار اس نے کئی صدیوں سے کی تھی۔ اسکے حوصلوں میں جان سی آ گئی۔ اس کے بے جان بازو طاقتور اور مضبوط ہونے لگے، اس کی خشک آنکھوں میں امید کا چہرا مسکرا کر اسے مسکرانے پر آمادہ کر رہی تھی، گاؤں اس نوجوان پُرمہر امید کو اپنی بانہوں میں بھر کر اسکے رخسار چومنے لگی، اسکے ہاتھوں کو اپنے لبوں پر رکھ کر دیر تک اس کی خوشبو کو سونگتی رہی۔ بے امید گاؤں اس امید کے آنے کی خوشی میں جھومنا چاہتی تھی، دیوانہ وار خوشی منانا چاہتی تھی، کوچہ کوچہ، دشت دشت بہت تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے مردہ لوگوں میں اعلان کرنا چاہتی تھی کہ صدیوں کی آس اب ختم ہوگئی ہے، اسکا بیٹا آیا ہے، وہ پہاڑی کی چوٹی پر دوڑ لگانا چاہتی تھی، صنوبر کے پیڑوں کو بانہوں میں بھرنا چاہتی تھی، مغرور چاند سے آنکھ ملانا چاہتی تھی، مولہ سے سوہند تک چلنے والی ہواؤں کو یہ پیغام سنانا چاہتی تھی، وہ اس خوشی میں رقص کرنا چاہتی تھی، اتنی خوشی اسے کبھی میسر نہ ہوئی تھی وہ اب پاگل ہونے تک ہنسنا چاہتی تھی۔

پھر اچانک سے وہ یک دم سے خاموش ہوگئی، یکدم اسکے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی، خشک آنکھیں کیسے بھی کر کے سالوں کی تپسیا سے ایک قطرہ آنسو بہا کر امید سے سوال کر بیٹھے، ''تم ہمیں چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے نا؟'' امید جب تک جواب دیتا گاؤں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی ''مت جانا، اب یہاں سے کبھی مت جانا، ہماری سانس نکل نہیں پاتی، زندہ ہم رہ نہیں پاتے، موت مہربان نہیں ہوتی، زندگی ناراض نہیں ہوتی، یہاں کے حقیر لوگ اپنی ذات میں خود کو شاہ اور حقیقت میں شاہ کے غلام مانتے ہیں۔ تمہیں نہیں جانا ہے، یہاں غلامی کا راج اس قدر بالا ہے کہ یہاں کی ہوائیں، یہاں کے پہاڑ تک غلام ہیں۔ یہاں سانس غلام، تو یہاں آواز غلام ہے، یہاں چرواہے کا بے زبان ریوڑ غلام، تو پیٹ میں پلتا ننھے معصوم غلام ہیں۔ یہاں استاد

غلام، یہاں طالب غلام ہیں، یہاں ملا غلام، یہاں فقیر غلام ہیں، یہاں سفر خان و بابو کے قبروں کی مٹی غلام، یہاں خاندان ویتیم غلام، یہاں ہر وہ شہ جو سانس رکھتی ہو یا وجود رکھتی ہو غلام ہے، یہاں گنگناتی سوہندہ مولہ غلام ہیں، کھیل کے میدان سے لیکر سردیوں میں ایک بار آنے والا گونشاب (پرندہ) غلام ہیں۔۔۔سنو بیٹے! تمہیں نہیں جانا ہے یہاں سے، یہاں تو ماں غلام ہیں۔‘‘

امید مسکرا کر سب باتیں سن رہا تھا، نہ جانے کس قدر درد سہا تھا امید نے کہ اتنا درس سننے کے بعد بھی مسکرا کر کہنے لگا’’یہاں سے اب نہیں جانا مجھے، یہاں اب اس ماں کی آغوش میں رہنا ہے، اب مجھے یہاں کی ہواؤں کو سمت دِکھانی ہے، یہاں کے پہاڑوں کے سینوں میں امید جگانا ہے، یہاں مولہ وسوہندہ کے گیتوں کو زندہ رکھنا ہے، یہاں نسلوں کی سوچ وخیال کو بدلنا ہے مجھے۔ میں اپنے گاؤں میں انجان رہ کر، انجان بن کر، انکو اپنا بناؤنگا، ان کو آپ کی حالت دکھاؤنگا، سانس لینے کی آزادی کیا ہے، انہیں سمجھاؤنگا۔ میرا وعدہ ہے آپ سے میں یہاں سے کبھی نہ جاؤنگا۔‘‘

پھر امید وہاں سے اٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ غلامی کے دلدل میں اسے آزاد کرانے اتر گیا، وہ سالوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی کبھی تھکا نہیں تھا، بس کبھی اسے ذرا سی آرام کرنے کا من کرتا تو گاؤں کے پہلو میں سر رکھ کر سو جایا کرتا تھا۔ کبھی کسی خشک میدان، تو کبھی سوہندہ مولہ کے نم پتھروں پر، کبھی کسی درخت کے سائے میں تو کبھی کہیں خوشک فصل میں تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر نکل جاتا اپنے لوگوں میں انہیں آزادی سے سانس لینے کا درس دینے۔ وہ دن رات بس بھاگ دوڑ ہی کرتا رہا، کبھی اس کی جسمانی بیماری اس پر حاوی ہو جاتا، تو گاؤں کے پہلو میں لیٹ کر اسکے درد کو محسوس کرتا۔ جب گاؤں کے درد کے سامنے اسکا درد کمزور پڑ جاتا، تو وہ پھر سے نکل پڑتا ماں کی سرزمین پر بے سروآسرا لوگوں سے ملنے، جنکا میراث نسلوں سے غلامی تھا۔ ہر ایک سے مسکرا کر ملنا اپنے درد کو بھول کر ماں کی سینے میں لگی آگ کو، ماں کے پیغام کو ان تک پہنچانے کے لیے ہر وقت مجلس میں لگا رہتا۔ نا مسجد چھوڑا، نا اسکول، نا میدان چھوڑے نا پہاڑ، نا نہر چھوڑے، نہ باغات، نا گھر

چھوڑا، نادکان۔ ہرسمت نکل پڑتا اپنی ماں کی پکارکو اسکے بیٹوں تک پہنچانے کے لیے وہ دن رات کام کرتا رہا، شعور بانٹتا رہا، امید جگاتا رہا، روشنیوں کا چراغ جلاتا رہا۔

جب وہ اس قدر کامیاب ہوا کہ سالوں سے بے خبر ماں کے بیٹوں کو ماں کا پیغام سنانے میں، تو اپنے کام کو یک مشت پھیلانے اس پیغام کو ہرزبان زدعام کرنے کیلئے اسے اپنی جان تک قربان کرنا پڑا۔ وہ تراسانی کے میدان میں مادروطن کے پیغام کو آواز بخشتا ہوا لوگوں کو ایک ساتھ آگاہ کر دیا کہ ماں کی تڑپتی آنکھوں کے درد سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ امید جگا کر گزران کے پہلو میں اپنی ماں کی آغوش میں سو گیا، گاؤں کی اس امید کو اگر دشمن کی گولی لگ جاتی، تو ماں سوچتی کہ کاش اسے میں جانے دیتی مگر ماں کا یہ لال آخری لمحے بھی اپنے گاؤں، اپنے وطن مادر کو افسوس کرنے نہ دیتے ہوئے اپنے ساتھی سمت خود کو خود ہی قربان کر چلے۔
ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا کہ وہ اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا، اور وہ قائم رہا اپنے اس وعدے پر، اس نے جس سحر اس دھرتی پر قدم رکھا تھا، اسکے بعد پھر کبھی نہ گیا اور اب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے وعدے سے جڑ کر ماں کی آغوش میں آسودہ خاک ہوا۔

آج سوچتی ہوں، امید شاہموز کی پہاڑی سے اتر کر میرے گاؤں کے گھپ اندھیرے میں روشنی بخشتے ہوئے خود کو فنا کر چلا، مگر گاؤں پھر بھی مسکرا رہا ہے، اسے مسکراتا دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ امید اتنے دیئے روشن کر کے گیا ہے کہ گاؤں انکی روشنی میں بیٹھ کر، امید کے مشن کی گفتگو سننے میں مگن ہے اور شام ہوتے ہی وہ چراغ اپنی اپنی سمت، امید کے پیغام کو خود کی روشنی میں اور کئی چراغوں میں روشن کر رہے ہونگے، وہ امید کے کاروان کے وہ چراغ ہیں، جو امید کو زندہ رکھ کر اسکے سفر پر جل رہے ہیں۔
وہ میرے گاؤں کی امید ہے، وہ میرے گاؤں کا ضیاء الرحمٰن ہے، وہ چراغ دلجان و بارگ جان ہیں، وہ روشنی بخشتی چراغیں، مجھ جیسی بہن کا شال ہے۔

☆☆☆

گزان سے گزان تک کا سفر

تحریر: مجید بلوچ

ضیاء عرف دلجان کی پیدائش گزان میں ہوا اور چار سال کی عمر میں شہید دلجان کا خاندان گزان سے انجیرہ منتقل ہوگیا۔ ضیاء نے ابتدائی تعلیم انجیرہ سے حاصل کی، غربت وقبائلی جنگوں کے باوجود انکے والد صاحب انہیں مزید تعلیم کے لئے حب چوکی لے آئے، ضیاء جان نے آٹھویں کلاس تک گورنمنٹ ہائی سکول حب سے تعلیم حاصل کی اور وہیں سے بی ایس او میں شامل ہوکر اپنی بساط کے مطابق جہد کرتا رہا، ضیاء الرحمٰن کے باقی دوست پرائیویٹ اسکولوں میں داخلہ لینا چاہتے تھے، مگر ضیاء اپنے گھر کے حالات سے بخوبی واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ میں سکول فیس وغیرہ کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتا اور نہ ہی میرے گھر والے یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں، مگر ضیاء ہمیشہ نیا راستہ تلاش کرنے والوں میں سا تھا، اسے مزید تعلیم کا شوق تھا، تو اپنے اخراجات پورا کرنے کے لیے اس نے میڈیکل اسٹور پر کام کرنا شروع کر دیا اور اسکول میں داخلہ لے کر میٹرک کی تعلیم مکمل کرلیا۔ میٹرک کے بعد وہ پراویٹ امتحان دیتا گیا اور مختلف جگہوں پر کام کر کے اپنے گھر کے اخراجات وغیرہ میں اپنے والد اور بھائیوں کا ہاتھ بٹاتا رہا۔

2008 میں ضیاء شیخ زید ہسپتال میں ڈیوٹی پر لگا، ضیاء کی نوکری سے اس کے خاندان کے لوگ خوش تھے، مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ ضیاء صرف ایک عام آنسان نہیں ضیاء کا سفر نوکری گھر بار نہیں تھا، وہ ایک انقلابی سوچ کا مالک تھا، وہ سوچ جو اس نے اپنے دل و دماغ میں بچپن سے پال رکھا تھا، اسے اب تک بہت کچھ کرنا تھا، ضیاء جان نے ششم کلاس سے بنیادی سیاست بی ایس او استار سے شروعات کیا تھا، وہ شہید حمید شاہین سے کافی متأثر تھا، شہید سنگت ضیاء نے بی ایس او کے انضمام میں کافی محنت کیا اور اس عمل سے خوش تھا، وہ شروع سے مل کر یکجاہ کام کرنے کا حامی تھا، مگر انضمام کے بعد بی ایس او کے چیئرمین امان اور دیگر مرکزی ممبران سے اختلافات کے

بعد انہوں نے کونسل سیشن سے بائیکاٹ کیا۔

ضیاء ہمیشہ خود سوچتا اور اپنا فیصلہ خود کرتا، جو اس کی سمجھ میں آتا اس پر سوچتا متفق ہوتا، پھر عمل کرتا کبھی کسی پارٹی یا تنظیم میں کسی شخصیت کی خاطر سیاست نہیں کی، ضیاء بی ایس او میں مختلف عہدوں پر رہا۔ انضمام کے بعد مشترکہ بی ایس او حب زون کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ضیاء کافی ایکٹیو ورکر تھا۔ نواب بگٹی کی شہادت کے بعد ہڑتالوں، احتجاجی مظاہروں وسرکلوں میں دن رات محنت کرتا تھا۔ ہر رات کسی اور مختلف جگہ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی ایک کے بیٹھک میں سوتا کہ اگر اگلے دن کہیں باقی دوست دیر سے آ گئے تو ہڑتال ناکام نا ہو جائے۔ نواب بگٹی کی شہادت کے بعد کے ہڑتالوں کے آیف آئی ار میں ضیاء جان کا نام بھی تھا، مگر ضیاء جو روشنی بخشنے نکلا تھا بھلا اسے جیل زندان کا کیا ڈر تھا۔

مگر وہ کبھی بھی جیل یا اخباری سیاست پر یقین نہیں رکھتا تھا، وہ بس اپنے تنظیم کے کام کو مکمل کرتا تھا۔ ہڑتال شروع ہوتے ہی اسکے اکثر سینئر دوست پولیس کے ہاتھوں خود کو گرفتار کروا کے چھوٹی شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر ضیاء کو اپنا کام مکمل کرنا ہوتا تھا، نام سے اسے کوئی بھی سروکار نہ تھا، وہ جانتا تھا کہ ہم غلام ہیں، غلامی سے آجوئی کا رستہ جہد مسلسل اور لوگوں کو بیدار کرنے میں پنہاں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ لوگوں میں شعور پیدا کرنا ہے، کہیں دوست رشتہ دار بن کر، تو کہیں مسافر بن کر، وہ ہمیشہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

ضیاء بی ایس او آزاد کے وقت باقاعدہ اس کا رکن تو نہ تھا، مگر اس نے زہری، حب، کوئٹہ میں اپنے سرکل وارد گرد کے دوستوں کو بی ایس او آزاد میں نہ صرف شمولیت کے لیے قائل کرتا رہا بلکہ انکے ساتھ رہ کر انہیں کام کرنے کا طریقہ سکھاتا رہا۔ اس نے ہمیشہ نام، شہرت، واہ واہی اور دشمن سے بچنے کا درس دیتا تھا، وہ بی ایس او کے تمام نامی گرامی لوگوں سے واقف تھا اس لیے اپنے سرکل کے دوستوں کو اس متعلق ہر وقت رہنمائی کرتا۔

سیاست پلیٹ فارم سے جڑے رہ کر جب قومی آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو ہرزبان پر بی ایل اے کا نام تھا، مگر ضیاء نے گفتار کو چھوڑ کر عملی جدوجہد کرنے والوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا، وہ جانتا تھا قومی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا واحد راستہ مسلح جہد وجہد، بمع قلم ہے۔ایک بار سنگت کو کہیں سے بی ایل اے کی طرف سے شائع کردہ سی ڈی ملی جس میں ایک کمانڈر بلوچ قوم کو تیار رہنے کا ترغیب دیتا ہےاور کہتا ہے کہ بلوچ قوم تیار رہے،ہم خود ان سے اپنے طریقہ کار سے مل کر انہیں جہد کا حصہ بنائینگے۔ضیاء جان نے بی ایل اے کا سپاہی بننے کے لیے خود کو تیار رکھنا شروع کر دیا پر اس بیچ وہ اپنے سیاسی کاموں کو بھی بخوبی نبھا تا رہا۔

پھر وہ دن بھی آیا جس کا انتظار ضیاء برسوں سے کر رہا تھا، وہ بہت خوش تھا اسکی خوشی حق بجانب تھی، ضیاء پیدا ہی جہد کرنے کیلئے ہوا تھا، اپنے لوگوں کو راستہ دکھانے، ان کی بزگی وغلامی کے خلاف لڑنے کے لیے ضیاء اس دنیا میں آیا تھا، ورنا کون ہوش سنبھالتے ہی اپنے دل میں ریاست کی بربریت وظلم کو دیکھتے ہی اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جہاں لوگوں کو اپنی ذات اور زندگیوں سے ہی فرصت نہیں ہو۔لیکن ضیاء تو ضیاء تھا وہ سوج بن کر ہرسمت پھیلنے کی تیاریوں میں مگن تھا۔

مجھے بخوبی یاد ہے جب اس نے مجھے فون کر کے ملنے بلایا، ایک ہفتے تک صرف لیکچر دیتا گیا، میرے اوراس کے بیچ سرکلوں کے علاوہ کئی بار اس طرح کی گفتگو ہوتی رہی، مگر اس بار کی ملاقات میں اس مہربان چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی تھے، ہم دوست جہاں کھڑے تھے ضیاء وہاں سے آگے نکل چکا تھا، ضیاء اپنے ضیاء کو وطن پر قربان کرتے ہوئے دلجان بن چکا تھا، وہ حب کے گلیوں سے نکل کر بلوچستان میں داخل ہوا تھا۔

اسکی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس بار کا سفر سرخرو ہونے کا تھا، میں بس اسے سنے جا رہا تھا، آخر کار جب مجھے مطمئن، پا کر کہا کہ اب بی ایل اے میں شامل ہو کر قومی غلامی کے خلاف جنگ کا حصہ بننا ہے، ضیاء ہر وقت مجھے

کہتا کہ پہلے اپنے گھر کی پوزیشن بناؤ ابھی ہم شہر میں ہیں، کل ہم پہاڑوں میں جائینگے، ہمیں وہ موقع نہیں ملے گا، جو ابھی ملا ہے، وہ میرے گھر کے حالات سے بخوبی واقف تھا، وہ ہر پہلو پر نظر رکھتا تھا، اسے میرے گھر کی فکر تو تھا، مگر اپنے گھر سے بے خبر دیوانوں کی طرح بس چلتا ہی رہا، وہ میری زندگی میں ایک استاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

جس استاد نے کافی کچھ سکھایا، کچھ عرصے بعد میرے استاد ضیاء جان کے قریبی دوست جن میں شہید خلیل، شہید سلیمان، شہید زبیر دشمن کے ہاتھون گرفتار ہوئے تو سنگت نے شہر چھوڑ کر پہاڑوں کا روخ کرلیا، پھر کبھی کبھار بات ہوا کرتا تھا، شروع دنوں میں سنگت بہت کم نیٹورک پر آتا اور فون پر حال حوال کرتا، کبھی جو مذاق میں سوال کرتا کہ تین سال بعد بھی d j ہو یا کمانڈر بنے تو مجھے کہتا ہمارا مقصد کمانڈر بننا نہیں بس دعا کرو اس جہد کو درست ہاتھوں میں تھما کر ایک سپاہی ہونیکا حق ادا کر کے آسودہ خاک ہو جائیں، ہمارا مقصد اپنے کام کو آگے لیجانا ہے۔

سنگت کافی ہنسی مذاق کرتا تھا، مگر کام کے متعلق سخت مزاجی کا مظاہرہ کرتا، پریشر دیتا جب کام ڈھیلا یا سست ہوتا۔

یہ سفر عاشق مزاجی کا یونہی چلتا رہا، سنگت بولان سے قلات پھر پارودشور کے کیمپ میں رہا، ہروقت دیدہ دلیری سے لڑتا رہا، ہر ناممکن مشکل کا ہنس کر مقابلہ کرتا رہا، اسی خواری محنت ایمانداری کے بعد وہ زہری کا کمانڈر بن کے سرزمین سے کیا ہوا وعدہ نبھانے چلا گیا۔ سنگت نے جھلاوان کا کمانڈ سنبھالا اور کام کو ترتیب دیتا رہا، اپنے کئی سالہ تجربے و مخلصی کو کارآمد بناتے ہوئے، سیاسی و مسلح کام انجام دیتا رہا، اسکا ایک ٹھکانہ کبھی نہ ہوا، وہ دن کہیں تو رات کہیں کاٹتا بس اپنے کام میں مگن پاگل پن کی حد تک چلتا رہا۔

جب دشمن نے میرے سنگت پر حملہ کیا، تو سنگت آخری لمحوں تک دشمن کے سامنے لڑ کر آخری گولی اپنے لیے بچا کر رکھا، تا کہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو، بزدل دشمن ضیاء کو کیا کبھی کوئی قید کر سکا ہے، وہ تو من مست ہے، جس طرف چاہے، اس سمت پھیل جاتا ہے، جسے تم کم عمری میں خالی ہاتھ گرفتار نہ کر سکے، اب تو وہ آہن بن کر ابھرا تھا، اب مجال کہ ذرہ بھر خوف اسکے دل میں آیا ہو، موت کرائے کے قاتلوں کیلئے خاتمہ ہوگا، مگر ضیاء کے لیے روشنی بخشنے کا سنہرا موقع ہے، تب ہی تنظیمی رازوں کو اپنے ساتھ دفنانے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے ہزاروں سالوں کی زندگی حاصل کر گیا۔ ضیاء نے جس طرح بندوق سے قومی آزادی کی خدمت کی، اسی طرح وہ اپنے قلم سے بھی قوم کو بیدار کرتا رہا، دشمن سنگت کو بار بار سرنڈر کرنے کا کہتا رہا، مگر مجال کہ کبھی سفر میں سنگت کے قدم ڈگمگائے۔

کہنے کو کافی کچھ ہے حقیقی زندگی وہی ہے، جو ضیاء جی کر چلا گیا۔ وہ زندگی چند اوراق کا نہ محتاج ہے، نہ ہی میری اتنی بساط ہے کہ انہیں الفاظ میں اتار سکوں، بس ایک ارمان دل میں ہے کہ کچھ تو لکھوں تا کہ یہ جو جلن، جو آگ لگی ہوئی ہے سینے میں، تھوڑی تسکین پا سکے۔ بس دلجان کے کچھ پیغامات کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔

''دشمن کے سامنے کبھی سر مت جھکانا دشمن کو گولی سے جواب دینا ہوگا''، ''کام کرو ضروری نہیں گولی چلانے میں پرفیکٹ رہو، آپ ایک شخص سے ملاقات کر کے چار باتیں کرو، تو سمجھ لو کہ آپ نے آج کا کام مکمل کر لیا، آپ پورے سال میں ایک جہد کار کو تیار کر و اور دوسرے سال آپ اور آپکا وہ دوست ایک ایک اور جہد کار تیار کریں تو یہ کاروان بڑھتا رہیگا''

سنگت ضیاء نے شہر سے جانے کے بعد بہت سے دوست وعزیزوں پر امید رکھا تھا کہ وہ بھی اسکی طرح کارواں کا حصہ بنیں گے، مگر خوف لالچ اور حرس سے ہر ایک آپ کی طرح صاف نہیں ہوسکتا۔

سنگت ضیاء اپنا من چاہا زندگی جیا وہ بی ایس او میں رہا اپنے کام وعمل سے ثابت قدم رہا، وہ عام زندگی میں بھی کبھی مایوس نہ رہا، جنگ کے میدان میں گواہی اسکی آخری گولی دے رہا ہے۔ ضیاء نے ضرور خواہش کیا ہوگا کہ زہری میں آسودہ خاک ہونے کا، تب ہی 40 سال پہلے شہید کے دادا شاہ دوست میروزئی زہری کو زہری میں آسودہ خاک کرنے کے بعد میروزئی خاندان کے کسی اور فرد کا قبر اس قبرستان میں نہیں تھا، چالیس سال بعد اس قبرستان کو میرے دوست ضیاء نے آباد کیا اور اسے اسکے دادا شاہ دوست کے پہلو میں آسودہ خاک کیا گیا۔ شاید شہید دلجان کے دادا بہادر نواسے کو ملغوے کی چوٹی سے بندوق کاندھے میں لٹکائے اترتے دیکھ کر اس کی خوشبو سے پہچانا ہوگا اور اپنے ہم عمر نوروز خان کو خبر سنایا ہوگا کہ میرا نواسہ اس کارواں کا حصہ بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہونے کو آیا ہے۔

ضیاء تم لوٹ آؤ

تحریر: مہاران بلوچ

اس گاؤں میں اندھیروں کا راج تھا، ظالم دندناتے پھر رہے تھے، خون کی ندیاں بہہ رہیں تھی، عزت و غیرت کے نام پر قبرستان بھرے جا رہے تھے۔ قبائلی جنگیں اور خوف کا عالم، ایسے علاقے میں ایک لڑکی کا جینا بہت مشکل ہوتا ہے، مرد تو پھر بھی ان حالات میں رہ کر یا ان میں شامل ہو کر سیکھ جاتے ہیں، گاؤں میں گھر بڑے اور کشادہ ہوتے ہیں، لوگ بڑے دل لیے یہاں پیدا ہوتے ہیں لیکن یہاں وہ معاشرتی دور تھا کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ سرداروں کی بھٹی میں عام لوگ مرمٹ رہے تھے، خاندان کے خاندان بے یار مددگار ہو گئے تھے، انسانیت نام کا شہ یہاں سے کوچ کر گیا تھا۔

ایک شام ایسی آئی کے شاہموز کی چوٹی سے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، وہ مغرور طوبے (چاند) جو ہمیشہ اپنی چاندنی پر نازاں تھا آج دھیمی پڑ گئی تھی، نجانے اسے کیا ہوا ہے۔

میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اچانک امی نے کہا کہ ''کیا ہوا بیٹا، ایسے کیوں اداس ہو؟''
میں نے کہا ''امی آج چاند کی چاندنی اتنی دھیمی کیوں پڑ گئی ہے کیا وجہ ہے؟''
امی بولی ''بیٹا جب سورج اور چاند کو خود سے بھی زیادہ روشن شہ نظر آئے، وہاں اسکی مغروری کم پڑ جائے، پھر وہ اس سے چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔''
''ماں ایسا لگ رہا ہے، آج کوئی چاند کی چاندنی سے زیادہ روشن ہے، اسے اسکی مغروری پر ڈانٹ پلا رہا ہے، تبھی تو چاند یوں دھیمی پڑ گئی ہے۔''

چاند کی چاندنی کو یوں ماند دیکھ کر گاؤں کے سب بچے پریشان تھے، کیونکہ اسی روشنی میں وہ اکثر اپنے گھر کے پاس شثوک کھیلتے تھے، آج سب جلدی جلدی اپنے گھروں کو واپس لوٹنے لگے۔

میں نے اس چاندنی میں بھی اپنے لوگوں کو اندھیرے میں پایا، مجھے چاند کی اس مغروری سے بہت گھن آتا تھا کہ اس روشنی کے باجود بھی میرے لوگ اندھیری راہوں میں بھٹکے ہیں۔ چاندنی کی روشنی سے قبریں واضح ہو جاتی تھیں اور ہر دن قبروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے کسی اور روشنی کی تلاش کی آس لگ گئی تھی، میرا جی اس چاند کی روشنی سے بھر گیا تھا۔ چاند چاندنی اور سورج کی روشنی میرے لوگوں کو اندھیرے سے نکالنے میں ناکام تھی۔ میں اب اس چاند، چاندنی اور سورج کی روشنی کو روشنی ماننے سے انکار کر چکا تھا، اب مجھے ایک اور روشنی چاہیے تھی، جو میرے وطن کے لوگوں کو ایک آزاد سوچ دے جو انہیں ایک ہمدرد کی طرح اپنے حق کے لیے لڑنا سکھائے، جو ایک روشنی بن کر ایک ایک روشن سویرا کا پاسبانی کرتا ہوا نظر آئے۔

اس مغرور چاند کی روشنی کو یوں لاچار دیکھ کر میں نے امی سے پائے جواب کو اپنا لیا، اس روشنی نے اگر میرے لوگوں کو نہیں بدلا، تو میں آنے والے روشنی سے یہی امید وابستہ کر کے سو گئی، بہت وقت لگا اس روشنی کو سمجھنے میں لیکن جب اس چاندنی کو سامنے پایا تو میں سمجھ گئی، اس دن سورج کس روشنی سے گھبرا رہا تھا۔

یہی تو ہے وہ، جو شاہموز کی چوٹی پر بیٹھ کر اس دن مغرور چاند سے مخاطب تھا، اس نے چاند کو بتا دیا تھا کہ میں آیا ہوں اپنے لوگوں کو بدلنے، میں آیا ہوں انہیں شعور بخشنے اور حقیقی روشنی سے متعارف کروانے۔ تمہاری چاندنی میں میرے لوگ مارے گئے، میرے مادرِ وطن کی کوکھ میں قبرستانوں میں اضافہ ہوتا گیا، میں آیا ہوں انہیں آگاہی دینے اس دن چاند اس کے سامنے شرم سے دھیمی پڑ گئی تھی۔

میں اس روشنی سے واقف تھی، میں اسے جانتی تھی، میرا اس سے بہت پرانا رشتہ تھا، میرے خیالوں کا، میری سوچ کا میری تلاش کا اس سے رشتہ تھا، یہ دلجان تھا میں اسے ضیاء کے نام سے جانتی تھی۔

ضیاء میرے گاؤں کا تھا، ضیاء میری تلاش تھا، میری تلاش مجید، حئی، صدام، امتیاز کے بعد ضیاء تھا۔ ضیاء لوٹ کر آ گیا تھا، ضیاء اس بار لوٹا تھا اور اس اندھیرے کو مٹانے اور اس اندھیرے سے لڑتا ہوا فنا ہو گیا، ضیاء نے وہ روشنیاں پیدا کیے کہ آج بھی جب چاند اپنی چاندنی کے عروج پر ہوتا ہے، تو میرے گاؤں میں اسکی روشنی کمزور پڑ جاتی ہے، آج شاہموز کے دامن میں بیٹھے ضیاء کے جلائے شمعوں نے پورے گاؤں کو روشن کیا ہوا ہے، آج مغرور طوبے اپنے حد میں رہتے ہوئے آ کر چلا جاتا ہے۔

ضیاء لوٹ آیا تھا اس اندھیرے کو مٹانے۔ ضیاء لوٹ آیا تھا میری تلاش کو مٹانے۔ ضیاء لوٹ آیا تھا بے حس چاند کو سمجھانے کہ اسکا کام لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی دکھانا ہے۔ آج ضیاء نہیں تو اس سوچ کو سمت دینے کئی ضیاء پیدا ہو گئے۔ ضیاء لوٹ آیا تھا اسے پھر سے لوٹنا ہے۔

میں آج بھی اسی چوٹی سے تمھاری خوشبو کی امید لیے بیٹھی ہوں، آؤ! ہمیں سمت دو۔ آو! ہمیں روشنی دو۔ آو! ان اندھیروں کو مٹانے کی امید دو۔ آو! ہمیں ایک نیا سویرا اور آزاد روشنی دو۔ آو! ہمیں اپنے حق کے لیے لڑنے کا سلیقہ دو۔ آو! ہمیں ایک روشن خیال دو، ہمیں غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر دو۔ آو! ہمیں اپنی سوچ اور نظریئے سے آزادی کی کرن دو، ہمیں آزادی دو۔

ضیاء تم لوٹ آؤ......

دلجان تم لوٹ آؤ.....

دلو جان تم لوٹ آؤ....

بس یہی سوچ رہی تھی کہ کہ ایک آواز سی آئی، جیسے کسی نے میری آہ سنی ہو، جیسے کسی نے ہاتھ پکڑا ہو، جیسے کسی نے راہ دِکھائی ہو، جیسے کسی نے جگایا ہو، جیسے کسی نے یہ بولا ہو کہ میرا نظریہ تمہیں راہ دکھائے گا، میرا بندوق ظلم مٹائے گا، میں کئی ضیاء بنانے کے بعد فنا ہوا ہوں، میرے ہم فکر تجھے آزاد کریں گے، میرے سنگت تمہیں نیا سویرا دکھائیں گے، بس تجھے مضبوط ہونا ہے۔

ضیاء ایک حوصلہ، ٹک تیر ایک امید

تحریر: بانڑی بلوچ

دنیا کے وجود کو اربوں سال گذرے ہونگے، پھر اس پر انسان کے وجود کو بھی صدیاں ہو چکی ہے، انسان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا، جنگلوں صحراؤں سے نکل کر میدانوں میں آباد ہوا اور یوں سفر طے کرتے کرتے انسان اپنی ترقی کے عروج تک پہنچا اور آج دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے، جہاں انسان اپنی زندگی یہاں تک کے سانسوں پر بھی دسترس حاصل کر چکا ہے اور اس سفر کو انسانی علم اور شعور کہا جاتا ہے۔

شعور انسان کو علم کی جستجو میں لگا کر اسے تخلیق کار بنا دیتا ہے اور انسان ہر طریقے سے تخلیق کر کے یا تو چاند کو پہنچ جاتا ہے یا تو اپنے اندر پڑے احساس اور فضول ڈھانچے کے وجود کے مقصد کو پہچان لیتا ہے، اس زندگی کی دوڑ میں ہر کوئی کچھ نہ کچھ حاصل کر کے اس کے وصول کی جستجو سے جڑ جاتا ہے۔

ایسا ہی شعور اور نظریہ کچھ لوگوں میں اپنے اندر کے احساس کو پالنے اور اسے خود پر ہونے والے ناانصافی کے خلاف تیار کرنے کا ہنر تاریخ میں کئی لوگوں میں رہا ہے، جن کی داستانیں آج تک قائم ہیں کہ کیسے وہ اپنے شعور کو نظریے کی شکل دیکر اسے احساس میں ڈال کر لوگوں میں منتقل کرتے رہے اور انقلاب برپا کر گئے۔

یہی وہ شعور ہے، جس سے اپنے لوگوں کو روشناس کرانے کا بیڑا لیے ایک لاغر بدن، بلند حوصلہ، سر سے اپنے سے کئی گنا بڑے پہاڑ کو توڑنے کی جستجو لیے نوجوان اپنی تعلیم، گھر، دوست چھوڑ کر نکل پڑا اس جانب اور چلتے چلتے راستے میں کئی شمعیں روشن کر گیا اور یوں آخری سانسوں تک لڑتے ہوئے وہ روشن ستارہ بن گیا اور آج بھی

اپنے جلائے شمعوں پر نظر رکھے ان کی تربیت کر رہا ہے۔

ضیاء ایک حوصلہ ہے، حوصلہ اس کمزور سوچ کو مضبوط بنانے کا، جو بے شعوری میں دشمن کی چالبازیوں کا شکار ہوجاتا ہے، ضیاء اسے شعور دیکر ایک الگ سمت دے دیتا اور وہ یوں چلتا ہوا ایک سمندر بنتا ہے، ضیاء ہمیشہ ضیاء پیدا کرتا رہا جو چل کر دلجان بنے اور ضیاء کی پھیلائی ہوئی اس روشنی کو ضیاء کے طرح دشمن کے لیے اندھیرے کا سامان بنالیں گے۔

ٹک تیر ایک امید ہے امید آنے والے کل کی امید، آنے والی فتح کی امید، دشمن پر قہر بننے کی امید، جھالاوان میں تحریک کو پھر سے زندہ کرنے کی امید، ملغوے میں اس بوڑھے صنوبر کی امید، بہن شہناز زہری کے گاؤں کی امید، ہر لکھے قلم کی جسے ضیاء سمیت دیتا امید، گاؤں میں نکلنے والے ہر صبح کی سورج کی پہلے کرن کی جس کے ساتھ ہی ضیاء خشک پڑے صحراؤں کو شعور دینے نکل پڑتا۔

ضیاء خود میں ایک مکمل کامیاب رہنمائی دینے والا استاد تھا، ہر وقت ہر کسی کی تربیت کرتا کسی کو قلم سے لکھنے کا ہنر دیتا تو کسی کو پڑھنے کی تلقین کرتا نا خود کبھی آرام کرتا نا کے کسی کو آرام کرنے یا کہ خود کی ذمہ داریوں میں کوئی کوتاہی کو برداشت کرتا، وہ جب آنلائن ہوتا تو سب کو کوئی نا کوئی ذمہ داری سونپ دیتا اور خود کسی نئے دوست سے ملنے نکل جاتا اور یوں وہ صحرا صحرا چل پڑتا ہر طریقے سے اپنے دوستوں کی تربیت کرتا رہا۔

وہ سکھا گیا جب اس نے تراسانی کے میدان میں لڑتے ہوئے اپنی ہر ایک گولی کا حساب رکھا اور بتایا کے ہمارے مقصد سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں اور اس قول کے ساتھ جڑ گیا کے آخری گولی تک منزل کا حصول جاری رہیگی اور یوں دشمن کے ہاتھ میں آکر دوست اور تنظیم کے لئے نقصان بننے سے شہادت کو ترجیح دی اور امر

ہو گیا۔

ضیاء کی شہادت بہت کچھ سکھا گیا، اسنے سکھایا کہ وقت کا تقاضہ ہے کاہلی اور کمزوریوں سے نکل کر خلوص نیت سے اپنے مقصد پر ڈٹے رہو، چاہے اس میں تمھیں موت آئے پر وہ موت اپنی سرزمین پر آخری سانس تک دشمن کے خلاف جہد میں نکل جائے، اسنے بتایا کمزوریاں اور بہانے ہزار رکھنے والے خود کو دھوکے میں رکھ کر اپنے مقصد اور مادرِوطن سے دغا کر بیٹھتے ہیں۔

میں یقین سے کہتی ہوں، آج ضیاء نہیں پر ضیاء کی دی ہوئی تربیت نے اسکے دوستوں کو اتنا مظبوط کر دیا ہے کے وہ ضیاء کے طرح نکل پڑے، اسکے قدموں کے نشان تلاش کرنے اور وہ یہ مانتے ہیں کے ضیاء شاہموز کے چوٹی پر بابو نوروز کے ساتھ کھڑا ہو کر ہمیں دیکھ رہا ہے، ضیاء بابو نوروز کو بتا رہا ہے کے میرے دوست میرے دیے ہوئے راہ پر نکل پڑے ہیں، اس خلوص و نیت کے ساتھ جس کی مجھے امید تھی اور بابو نوروز اسکے پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے داد دے رہا ہوگا۔

وطن کا سچا عاشق دلجان

تحریر: میر احمد

دلجان وطن کا سچا عاشق تھا، اپنے عشق کا اظہار کر گیا، محبت کے بہت سے رشتے ہوتے ہیں، ماں باپ سے محبت ہوسکتا ہے، بہن بھائی سے محبت ہوسکتا ہے، بیوی بچوں سے محبت ہوسکتا ہے، دوست واحباب سے محبت ہوسکتا ہے، اجنبی لوگوں سے محبت ہوسکتا ہے، رشتہ داروں سے محبت ہوسکتا ہے، ہم صرف انہی رشتوں کو جانتے ہیں، اسی محبت کو جانتے ہیں، مگر نبھانا نہیں جانتے ہیں، ہمیں کبھی کسی بات پہ ناراضگی ہوتی ہے، کبھی کسی تکلیف پہ جدائی ہوتی ہے، تو کبھی بدگمانی پہ رشتہ ٹوٹتا ہے۔

لیکن ایک اور عشق ہوتا ہے، ایک اور محبت ہوتا ہے، ایک اور دیوانگی ہوتی ہے، جس سے ہم ناواقف ہیں، جس سے ہم خفا ہیں، جس سے ہم انجان ہیں۔ وہ محبت وطن سے ہوتا ہے، وطن کے لاچار لوگوں سے ہوتا ہے، وطن کے شوانوں و بزگر سے ہوتا ہے اور خود وطن سے بھی ہوتا ہے اور وطن سے محبت کرنا ہم میں سے کچھ لوگ جانتے ہیں، کرتے ہیں، نبھانا جانتے ہیں، محبت کی لاج کو سلامت رکھنے کے لیئے اپنی جان بھی دیتے ہیں۔

دلجان اپنے وطن سے انتہائی محبت کرتا تھا، اپنے لوگوں کا درد سمجھتا تھا، اسے غلامی و آزادی کا علم تھا، اپنے حق کو لینے کا سلیقہ معلوم تھا، دلجان بہت سالوں سے اس عشق میں قدم رکھ چکا تھا۔

آخر وطن کا وفادار بن کے، اپنی سچی محبت کا ثبوت دیکر، آخری سانسوں کو مادر وطن کے لیئے قربان کر دیا، وہ کیا لمحہ ہوگا جب دلجان آخری گولی کا فیصلہ کر کے بندوق اپنی طرف موڑ کر وطن سے رخصت کر رہا ہوگا، وہ ماں کتنا یاد آتا ہوگا، جس ماں نے دلجان جیسے بہادر کو جنم دیا، پیار محبت لاڈ سے پرورش کیا، مادر وطن کے لیئے لوریاں

سنائیں، وہ بہن کس قدر یاد آ رہی ہوگی، جو ہر وقت بھائی کی راہ دیکھتی تھی، وہ شہروہ دوست سنگت اپنے ہم سفر ساتھی کس قدر یاد آتے ہونگے، رخصتی کا کیا لمحہ ہوگا، جب دلجان ان سب کے بارے میں سوچ کر ایک طرف مادروطن کی دیوانگی میں، سب کو بھول کر آخری سانسوں کو سنگت امیر جان کے دکھائے ہوئے رستے کو اپنا کر امر ہوگیا ہوگا۔ دلجان تم ہر اس دل میں ہو، جو اپنے وطن کے لیئے دوستوں کو ایک ہونے کا تربیت دیتا ہے، آج آپ کی قربانی رنگ لائی ہے، ہر باشعور ورنا قلم اٹھا کر آپ کی بہادری بیان کر رہا ہے۔

دلجان نے دشمن کے دل میں ایسا خوف پیدا کیا کہ جب بھی دشمن انجیرہ سے زہری کی جانب بڑھے گا، آپ کی بہادری کا خوف دل میں لیئے کانپتا ہوگا، ہر بار ایک ڈر و خوف کی سائے میں رہ کر نظر اِدھر اُدھر دیکھے گا کہ کہیں دلجان ہمارے سامنے نہ آ جائے کہیں پھر سے دلجان کے مقابلے میں شکست نہ کھانا پڑ جائے۔ یہ وطن دلجان کا ہے، دلجان کا تھا، دلجان کا رہیگا۔ دلجان مادروطن کے ہر کونے میں دشمن سے بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتا تھا، شوروپارود میں کبھی بولان تو کبھی زہری کے دھرتی پر جہاں بھی سنگت قدم رکھتا تھا، اپنے کام کو خوبصورتی کے ساتھ انجام دیتا۔

آؤ ساتھ میں ہاتھوں کو ہاتھ میں تھام کر دلجان کے کاروان کے راہی بن جائیں، دلجان کے دِکھائے ہوئے، رستے کو اپنا مقصد بنالیں۔ دلجان کے قربانی کو یاد کر کے دوشمن سے سامنا کریں، مادروطن کیلیئے اپنا کردار ادا کریں۔ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں۔ دشمن کے بچھائے ہوئے جال سے خود کو آزاد کریں۔ دشمن کو پھر سے دلجان کی طرح شکست دیں۔ سنگتوں کے کارواں کا حصہ بنیں۔ یہی زندگی ہے، ہمارا یہی مقصد ہے۔

دلجان جسمانی طور جدا ہوا ہے، دلجان کی سوچ وفکر، نظریہ اور شخصیت ہمارے دل میں ہے، زندگی کی حقیقت کو سمجھو توڑ دو غلامی کی زنجیروں کو، زندہ قوم ہو جاگ جاؤ، ہواؤں کے رخ کو بدلنا ہے۔

☆☆☆

دلوں پہ راج کرنے والا دلجان

تحریر: کامریڈ سنگت بولانی

کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ وہ سنہرے الفاظ کہاں سے لاؤں، جو تمہارے عظیم جہدِ مسلسل کو دنیا کے سامنے آشکار کر سکے، بس ایک چھوٹی سی کوشش کر رہا ہوں، اگر کوئی کمی رہ گئی تو مجھ جیسے ناقص سنگت کو بخش دینا۔

آزادی ایک خوبصورت احساس ہے، جس سے محبت تو سبھی کرتے ہیں لیکن بہت کم ہی انسان ایسے ہوتے ہیں، جو اس کو پانے کے لیے اپنی زندگی ہتھیلی پہ رکھ کر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے اس پر کٹھن راستے کا انتخاب اس امید پہ کرتے ہیں کہ وہ غلامانہ زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر کے، اپنے آپ اور اپنی قوم کو اس حسین احساس سے آشنا کر سکیں گے۔ اس مشکل و پر کھٹن سفر میں احساسِ غلامی رکھنے والا دلجان اپنی دھرتی کی مٹی سے بندھا ہوا تھا اور اس جہدِ مسلسل سے وہ اپنی آخری سانس تک جڑا رہا۔

سنگت کامریڈ ضیاء الرحمان عرف دلجان سے پہلی ملاقات جنوری 2013 میں ہوئی، جب میں دوستوں سے ملنے شور پارود چلا گیا اور وہی ملاقات پہلی آخری رہی، کئی دفعہ مجھے ملاقات کرنے کا کہا لیکن مختلف مصروفیات کی وجہ سے ہماری ملاقات نہیں ہو سکی لیکن وہ دو گھنٹے کی ملاقات آج بھی میرے ذہن کے ایک کونے میں محفوظ ہے، جسے قلمبند کرنا میری ناقص رائے کے مطابق انتہائی ضروری ہے۔

صبح کے دس بج رہے تھے، دوستوں نے آواز دی کہ چلو لکڑیاں لانے چلتے ہیں۔ میں نے اپنی بندوق اپنے کندھے پہ لٹکایا دوستوں کے ساتھ روانہ ہوا، واپسی پر ہم کیمپ پہنچے تو قریب راستے میں ایک سنگت نے آواز

دی ''اوسنگت پاٹ تے تخاس گوڑادانگ بریس'' (سنگت لکڑیاں رکھ کے ادھر آنا)، میں نے پیچھے دیکھا تو دو سنگت ایک جھونپڑی کے باہر بیٹھے تھے،لکڑیاں رکھ کر میں ان دوستوں کے پاس پہنچا۔ان دوستوں میں سے ایک دلجان اور دوسرا سنگت حق نواز تھا، جسے تمام سنگت سِٹو سِٹو کہہ کر پکارتے تھے۔

سنگت یہاں آکر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ دلجان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''سنگت ان دلکش بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں آکر میں آزادی کی سانسیں لے رہا ہوں، یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اپنی غلامی کے زنگ آلود زنجیروں کو توڑنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہوں۔'' میں نے پہاڑوں کی جانب نظر گھماتے ہوئے جواب دیا۔

''بالکل سنگت غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے ہم سب کو مل کر اس قبضہ گیریت کے خلاف مزاحمت کرنا ہے اور اپنے قوم و سرزمین کو اس قابض ریاست سے آزاد کرانا ہے۔'' دلجان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس دو گھنٹے کی ملاقات کے بعد میں واپس شہر آکر اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتا رہا اور کچھ عرصے بعد شہر سے واپس پہاڑوں کا رخ کیا اور پھر ہمارا رابطوں کا سلسلہ فون پر ہی ہوتا رہا۔

سنگت دلجان کی بھیجی ہوئی آخری میسج: ''سنگت ہمیں یہ بات ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ ہمیں کبھی بھی اپنے ذاتی مفادات، نام یا مراعات کے پیچھے نہیں بھاگنا ہمیں صرف اور صرف اپنے قومی سوچ و مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے دشمن کے خلاف آخری سانس تک مزاحمت کے ساتھ ساتھ اپنے قوم کو شعور بھی دینا ہے اور ہم سے جتنا ہو سکے، عوامی رابطے کو بحال کرنا ہے کیونکہ کسی بھی تحریک کی کامیابی عوام سے جڑی ہوتی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں جائیگی۔''

دلجان و بارگ، سنگت امیر الملک، سنگت ساتک اور سنگت محترم نے ہندوستان کے بہادر جہد کار چندر شیکھر آزاد کی یاد تازہ کرتے ہوئے، دشمن کے ہاتھ لگنے اور تنظیمی رازوں کے افشاں ہونے کے خطرات سے نمٹنے کے لیے آخری گولی سے اپنے جسم کا خاتمہ کرنے والے فلسفے پر عمل پیرا ہو کر موت کا استقبال مسکراتے ہوئے کیا اور ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

سنگت میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ اور تمام سنگتوں کی جہدِ مسلسل سے ایک دن بلوچ قوم کو آزادی کی صبح ضرور نصیب ہو گی اور اس دن بوڑھے، جوان سب اکٹھے ہو کر آپ تمام شہداء کی یاد میں چراغاں کرینگے اور اپنے آزادی کے گیت گائینگے۔

میرا غمخوار سنگت دل جان

تحریر: سالار بلوچ

دلجان کیلئے لکھنا، ضیاء کو بیان کرنا میرے جیسوں کی نہ بس کی بات ہے، نہ ہی لکھنے سے الفاظ کے وہ قرض ادا ہو جائیں گے اور نہ ہی میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوسکتی ہے۔ ضیاء وہ ہستی، وہ قلم کار، وہ زغم جنوک ہے جس کی مثالیں ممکن نہیں، اور یہ ممکنات میں شامل ہی نہیں کہ کوئی اس جیسا ہمنوا دوبارہ ہو، جو رہبر بھی، رہشون بھی، بزغر وشوہان کا درد محسوس کرے، گوریلا کمانڈر مہربان سنگت سے لیکر ایک غمخوار جس کے ہوتے ہوئے نہ مجھے کبھی کوئی پریشانی رہا نہ ضیاء جان نے مجھے پریشان ہونے دیا۔

ضیاء مجھ سمیت کئی دوستوں سے کہا کرتا سنگت ''لکھنگ نا کوشش کبو، درس تریسا کینہ کمی تے برابر کینہ'' لکھتے رہو درس دیتے رہینگے کمی کو پورا کرتے رہینگے۔ لیکن ضیا جان ہمارے جان سے گذر گئے اور کمی کوتاہی ہمیشہ کے لیئے رہ گئے۔

دلجان سے میں بچپن ہی سے واقف تھا، یہ میری خوش قسمتی ہی تھی، جو 13 سال کی عمر میں بھی دلجان مجھے اپنے ساتھ پکنک کے لیے تیار کرتا، ہم پکنک منانے جاتے اور سجی کے ساتھ استاد میر احمد کے پر فکر آواز سے پیر عمر کی وہ جنت نُما منظر سے اپنے پیاس بجھاتے۔ دن رات میں ڈھلتے گئے، دلجان کوئٹہ چلا گیا جاب کے سلسلے میں مجھے

کال کیا اور کوئٹہ آنے کو کہا، ضیاء سے ملنے کوئٹہ چلا گیا، پہلی دفعہ کوئٹہ سفر کر رہا تھا، راستے، سفر اور لوگ سب میرے لیئے انجان تھے۔ مجھے یاد ہے جب خضدار سے روانہ ہوئے تو ڈرائیور کھنڈ سے ہوتے ہوئے سنی سے مین روڈ پر نکل گیا۔ سواریوں کے پوچھنے پر معلوم پڑا آج تو خضدار سمیت قلات منگوچر پہیہ جام ہڑتال ہے کیونکہ منگوچر میں زیب لانگو کو فائرنگ کر کے قتل کیا گیا تھا۔

جب ہم منگوچر پہنچے، وہاں ہمیں گھنٹوں گذارنے پڑے، راستہ بند گاڑیوں کی لمبی قطار لگی وقفے وقفے سے زیب کے سپاہیوں کی بلاوجہ ہوائی فائرنگ تھی، میں کچھ پریشان بھی نہیں ہوا نہ ہی دل میں کچھ وسوسہ ہوا کیونکہ دل جان میرا انتظار کر رہا تھا اور وہ مجھے سنبھالنا اچھی طرح جانتا تھا، دلجان مجھے فون کرتا اور ڈرائیور سے بات کرتا، کب نکلو گے کب پہنچو گے اور بعد میں فون پر کم عمری کی وجہ سے مجھے حوصلہ دیتا رہا۔

ضیاء سے وابستہ یادیں اتنی ساری ہیں، انہیں قلم بند کرنا ان کی یاد میں کھو جانے اور ارمانوں میں بہہ کر دلجان کے ساتھ کوئی بے وفائی نا کر بیٹھوں، جو ہر وقت وفا سنگتی کا مثال رہا کرتا، ایک دوست جو اپنی آخری گولی اپنی لیئے رکھا کرتا تھا تا کہ سنگتوں کے راز، تنظیمی راز اپنے سینے میں رکھ کر سنگت امیر کے نقش قدم پے چلے۔ وہ سنگتی کو فرض کی طرح سمجھتا اور عمل کرتا اور ثابت کرتا رہا۔

دلجان کے اشتہاری ہونے کے بعد اس سے ملنے کیلئے، آنکھیں ترس ہی گیئے تھے، وقت سالوں میں بدل گئے ہم ان سے ملنے کے انتظار میں اور وہ وطن کے چاہ میں مگن رہے، پھر کہیں جا کر دلجان سے ملاقات ہوگئی، اب دل جان اور میں ایک فکر ایک سنگتی کے بنیاد پر ملے تھے، دلجان کے اشتہاری ہونے کے بعد جب 2014 میرا اور ایک اور دوست کا دلجان سے ملاقات ہوا تو 2 گھنٹے کا لیکچر اور ایک غلطی کے بنا پر کئی باتیں دلجان سے سننا پڑا

ہمیں اور آخر میں وہ سنگت کسی کام سے چلا گیا۔ دلجان نے ہنستے ہوئے اتنا ہی کہا سنگت ''اُست متو یرے ولے بھاز پاروئی اس نُمے'' سنگت دل نہ مانا مگر اس متعلق اور بہت کچھ سنانا تھا۔ سنگت کام کے متعلق بے حد سنجیدہ رہتا، وہ کسی بھی کام میں غلطی پر کافی کچھ سناتا اس متعلق سختی سے مشورہ دیتا، سنگت کے چلے جانے کے بعد میں وہیں ٹھہرا رہا اور پھر وہیں سالوں کے قصے محفلیں جو ہمارے درمیان ادھورے رہ گئے تھے وہ پورے کرنے لگے۔

اس کے بعد دلجان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دن رات مہینے اور عیدیں بھی دل جان کے سات گذرتے گئے، جب زہری میں دلجان سے ملاقات ہوتا، دلجان کے چہرے سے اس کے خواریوں کا اندازہ ہو جاتا، دن رات سنگتوں کو برابر کرنا، ان کیلئے سوچنا، ترتیب دینا، ان سے رابطہ میں رہنا، ہر وقت دوستوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہنا، کوئی دلجان سے ہی سیکھتا حتیٰ کہ اپنے علاج کے پیسے دوستوں کے ضرورتوں اخراجات میں دیتا، اسے یہ فکر لاحق تھا کہ کہیں کسی دوست کا کوئی مجبوری یا ضرورت اسے کام سے نہ روکے وہ ہر طرح سے دوستوں کی مدد کرتا۔

دلجان اپنا درد تکلیف ہمیشہ چھپائے رکھتا، جب اس کو تنگ کرتا طبیعت کا پوچھتا، دلجان ہنسی مذاق میں بات ٹال دیتا کہیں یہ پریشان نہ ہو جائے، ٹھکانہ نہ ہونے کے سبب دلجان اکثر شام کسی پہاڑ یا میدان، کسی فصل اور باغ میں یا کئی دفعہ مسجدوں میں گذارتا۔ کسی راستے پہ سفر کر رہے تھے، دلجان نے مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' دا مسجد نا مُلا کم بخت در وسہب نا روشنائی آن مالو ننے بش کرے'' اس مسجد کے ملا کم بخت نے کل ہمیں سویرے ہونے سے پہلے ہی جگا دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر معلوم پڑا گذری رات دل جان اور ایک سنگت نے

اسی مسجد میں رات گذاری تھی۔

غلامی کی زندگی ہواور گوریلا عیش وعشرت آرام دہ زندگی کا سوچنا ممکن نہیں اور دلجان کے لیے سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ وہ وطن کی گود میں کہیں بھی اپنارات بسر کرے اور صبح تنظیمی کاموں میں وقف کردے۔
دلجان اپنے ذات، اپنے گھر بار، بیوی بچوں، رشتہ داروں کو کبھی بھلا نا پایا ہوگا، جو اپنوں سمت ہر فرد کا محبت اپنے دل میں لیئے دشت وسحرا کا راہی بن جاتا ہے وہ اپنوں کو کیسے بھول سکتا ہے، مگر اسکے یہ رشتے کبھی اسے کمزور نہ کر پائے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا یہ سلسلہ یہ کام بس یہی سب کچھ اپنے ذمہ ہے۔ جو پورے کرنے کیلئے نثار جان، کا کا علی، شہید شیرا، امتیاز، عرفان عرف صدام بیتاب رہتے، اب یہ ہمیں پورا کرنا ہے اور دلجان نے شہید سنگتوں کی قربانی کالاج رکھتے ہوئے قربان ہوگیا۔

دلجان نے بزدل دشمن کو اس کے گھیرے میں رہ کر ہی شکست دیتا رہا، مسلسل تین گھنٹے دلجان اور بارگ جان لڑتے رہے، اور دشمن کی آخری شکست یہ رہی کہ وہ انہیں زندہ پکڑنے چلا تھا اور دلجان و بارگ جان کی آخری فتح ان کی آخری گولی سے ہوا۔

جاتے ہوئے بارگ جان اور دلجان نے وہ تمام تر ذمہ داریاں وہ کام ہمارے ذمہ چھوڑ کر چلے گئے، ان کو پورا کرنا دلجان و بارگ جان کے کاروان کو اچھی طرح آگے بڑھانا ہماری ذمہ داری ہے، ہمیں دشمن کو باور کرانا ہوگا، شہید کبھی مرتے نہیں، وہ دلجان کی شکل میں بارگ جان کی شکل میں نثار کا پیغام دلوش جان کی محنتیں، کا کا علی اور امیر الملک سمیت ہر شہید کی خواریوں کو جھالاوان کے مخلوق کو پہنچا چکے ہیں، دلجان نے زہری کے مخلوق کو سکھا

کر جان دی کے حقیقی کمانڈر حقیقی جہد کار حقیقی سپاہی کون ہے، وہ نواب جو حویلی سے اترتے ہوئے لرزتا ہے(کازبہ) آسمان سے دیکھ کر بھی رو پڑتا ہے یا وہ دلجان او بارگ جان جو ایک پرانے بائک پر کبھی سوئندہ، کبھی مشک بیل، کبھی پٹ اور مولہ کے بیٹوں پر نظر آتے اپنے مخلوق اور عوام کا درد سینے میں لیئے پھرتے ہیں اور وہی درد، دل جان کو بولان پارود نیمرغ سے زہری اور بارگ جان کو خاران مشکے سے زہری کھینچ لایا تھا۔

ٹک تیر کا کاروان رُکا نہیں، سفر کر رہا ہے، امیر جان کے پیروکار آتے رہینگے، سا تک جان کی شکل میں عرفان جان کی شکل میں بارگ اور ضیاء دلجان کی شکل میں۔ جب دل جان و بارگ جان کے کاروان کے ساتھی بارگ اور دل جان کے جاہ شہادت سے گذرتے ہیں ان کے حوصلے میں بولان کی بلندی سما جاتی ہے، دلجان و بارگ جان آج بھی زہری کے دشت و صحرا میں مورچہ زن اپنے عمل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

☆☆☆

کنا ہنینا دلجان

تحریر: نثار بلوچ

آج میں پہلی بار کچھ لکھنے کوکوشش کرر ہا ہوں اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیئے جس کے لیئے میرے یہ الفاظ بہت کم پڑھ جائینگے، جس کے لیئے میں پوری زندگی بیٹھ کرلکھ لوں، تو بھی کم ہونگے، یہ وہ سنگت ہے جو مجھے ہر وقت کہتا کہ کچھ لکھو، اپنے گل زمین کے بارے میں، یہاں بسنے والے باسیوں کے بےبسی کے بارے میں، اس ڈغار پے راج کرنے والے سرداروں کے فرسودہ نظام کے بارے میں یا اپنے شہید سنگتوں کے لیئے کچھ الفاظ لکھ لو لیکن اس وقت میں زیادہ توجہ نہیں دیتا لا پرواہی کرتا، مگر آج میں کچھ لکھنے جار ہا ہوں، افسوس! آج کہ دلجان میرے ٹوٹے الفاظ دیکھ سکتا، میرا حوصلہ افزائی کرسکتا، میں اسے دیکھا سکتا کے آج میں اسکے بتائے ہوئے راستے پر عمل کرر ہا ہوں، صرف میں ہی نہیں بلکہ اورکئی سنگت اسکے دیکھائے ہوئے رستے پر چل کر اسکے پیغام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

آج میں لکھ رہا ہوں اپنے استاد، اپنے عظیم سنگت کے بارے میں جسے ہم ضیاء بلوچ عرف دلجان کے نام سے جانتے ہیں، یہ پہچان، یہ نام، یہ سنگت اب زندگی بھر میرے ساتھ رہینگے۔ میری رہنمائی کرتے رہینگے، مجھے حوصلہ دیتے رہینگے۔ جس نے کچھ ہی پل میں مجھے سکھایا کے زندگی کا سفر کس ڈگر سے ہوکر نکلتا ہے، جس نے انگلی پکڑ کر دکھایا کہ اس زندگی کی حقیقت کیا ہے، آج اس ہی سنگت کے متعلق چند یاداشتیں قلم بند کرنا چاہونگا۔ میرا ایک سنگت جو کہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا، ہم دونوں ایک ہی سوچ وفکر کے مالک تھے، ہمارے دل و

جان میں صرف لمہ وطن کی آزادی کا خیال تھا۔

ہر کچاری ومجلس میں لمہ وطن کی باتیں کرتے اور دونوں اپنی رائے پیش کرتے ،میرا سنگت جو کہ میرے سوچ وفکر سے خوش ہوتا، اندر ہی اندر مجھے تیار کرتا رہا،محنت کرتا رہا اور مجھے اپنے ایک عظیم سنگت دلجان سے ملوانا چاہتا تھا،اس سنگت نے سنگت دلجان کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور دلجان تھا ہی ایسا،کہیں سے بھی اسے محبت کی خوشبو آجاتی وہ پہنچنے میں دیر نہیں کرتا تھا۔

کچھ دن بعد وہ سنگت مجھے سنگت دلجان سے ملنے کا بولا ، پہلے تو میں گھبرا گیا کہ سنگت مجھے کس شخص سے ملوانے جا رہا ہے؟ کون ہے وہ؟ میں کبھی تصور نہ کرسکا تھا کہ مادر وطن مجھ پر اتنی مہربان ہوگی کہ مجھے بھی آواز دے گی ، اسی لیئے ایک ڈرسا تھا کہ کون ہوسکتا ہے، جو اس قدر راز داری میں ملنا چاہتا ہے، پھر آہستہ آہستہ اس سنگت نے مجھے حوصلہ دے کر سب کچھ سمجھا دیا،تو میں سنگت دلجان بلوچ سے ملنے کو راضی ہو گیا،اس دن میرا دوست کام کے سلسلے میں کہیں دور چلا گیا تھا لیکن مجھ سے رابطہ میں تھا اور مجھے شہر سے تھوڑے سے فاصلے بہتی ندی کے پاس انتظار کرنے کا کہا، میں اس سنگت کے بتائے ہوئے جگہ پر چلا گیا اور شہید دلجان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔اس وقت میرے دل میں کئی باتیں،کئی سوالات آرہے تھے اور پاؤں کانپ رہے تھے،پہلی مرتبہ اپنے وطن کے ایک جہدکار سے ملنے جا رہا تھا،خوشی سے دل دھڑک رہا تھا،سانسیں بے قابو تھے،نہیں معلوم کہ وہ خوشی سے بے قابو ہو رہے تھے یا اس تجسس سے کہ جو آرہا ہے،جس نے فیصلہ کرلیا ہے اس کے مجلس میں بیٹھنے کا میرا طریقہ کیا ہونا چاہیئے ،جن سے سرکار و سردار کپکپاتے ہوں، انکے دیوان کے آداب کیا ہونگے۔

تب ہی کچھ لمحے بعد سنگت دلجان آ پہنچا! ہم ایک دوسرے سے سلام دعا کر کے بیٹھ گئے، میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا، کچھ پل خاموشی کے بعد سنگت دلجان نے اپنے ساتھ لائے ہوئے ڈیو بوتل کھول کر پہلے میرا گلاس بھر کے پھر اپنا گلاس بھرلیا۔ دلجان سے کچھ گفتگو ہوئی پہلے تو میں خوشی کے مارے کچھ بول نہیں پایا، پھر سنگت دلجان کے نرم لہجے اور اندازے گفتگو سے میرے جان میں جان آ گئی اور پھر محفل لگ گئی باتوں کا سلسلہ ڈیو بوتل کے ساتھ خوشگوار ہوتا رہا، سنگت دلجان کی گفتگو اور خوش مزاج چہرہ مجھے آج بھی یاد ہے اور اس کی باتوں میں کچھ جادو سا تھا، اس کی مجلس میں مجھے وقت کا کچھ پتہ بھی نہ چلا، جس دوست نے مجھے سنگت دلجان سے ملنے بیجھا تھا، وہ کال پے کال کرتا رہا کے آپ کے پاس دوست آ گیا ملنے؟ آپ دلجان کے ساتھ ہو؟ وہ پریشان ہی ہو رہا ہوگا لیکن مجھے شہید کے باتوں کے لطف نے کال اٹینڈ کرنے ہی نہیں دیا کہ میں دوست کے ساتھ دیوان کر رہا ہوں، میں دیوانہ وار بس سنگت کی باتیں سنتا رہا۔

وہ باتوں کا ہنر رکھتا تھا، اسے ہر کسی کا فکر ہوتا وہ جنگ کو ایک مضبوط رسی نہیں بلکہ ایک جار نما بنا کر آگے چلنے کا ہنر رکھتا تھا، تب ہی سنگت دلجان نے مجھ سے کہا کہ یہ عمر آپ کے بندوق اٹھانے کی نہیں ہے، یہ عمر آپ کے پڑھنے کی ہے، بندوق اٹھانے کے لیئے ہم کافی ہیں۔ بس تم اپنے پڑھائی پر توجہ دو اور رابطے میں رہو دلجان جانتا تھا کے کام کے مختلف شکل ہیں، بندوق کوئی اٹھائے تو کوئی اس بندوق کو ٹارگٹ دِکھائے یا پھر کوئی اس بندوقچی کو کسی بھی لحاظ سے کمک کرے، وہ ہر پہلو سے سوچتا غور کرتا اور پھر عمل کرتا یا بیان کرتا، ورنہ میرے اس کم عمری میں کوئی مجھے اپنے ذاتی راز نہ دے، وہیں دلجان جیسا سنگت مجھے ایک عظیم راز سے آشنا کرنے آ پہنچا۔

جب دلجان کے لائے ہوئے ڈیو بوتل میں کُچھ بچ گیا تھا، تو سنگت نے دیکھا کہ دور کھڑا ایک شوان اپنے بزگل

کے ساتھ اپنی دھن میں مگن ہے، تو دلجان نے اس شوان کو بلا کر ڈیو کا بوتل دے دیا اور اس شوان سے کچھ عجیب و غریب بات کرنے لگا تا کہ اس کو ہمارے بارے میں کوئی شک نہ ہو۔

کچھ لمحے بعد دلجان نے واپس کچاری شروع کر دیا اور مجھے کچھ ضروری باتوں سے آگاہ کیا، وہ ہر وقت کہتا کہ جب بھی کوئی مشکل ہو یا کوئی ضروری کام ہو تو ہم اپنے ایلموں سنگتوں کو کمک کرنے کے لیئے ہر وقت تیار ہیں، تھوڑی گفتگو کے بعد دلجان نے مجھے میرا کوڈ نام دے کر رخصت کیا۔

پھر ایک دن جب مجھے سنگت دلجان سے کچھ سامان درکار تھے، تو میں نے اسے بتا دیا اور وہ بھی یکدم راضی ہو کر مجھے وہ سامان دینے نکل پڑا۔ میں بھی اس کے بتائے ہوئے جگہے پر پہنچ گیا، کچھ لمحے بعد سنگت دلجان وہاں آ پہنچا اور بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا، میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہم بہت دور سے آرہے ہیں اور آگے بھی تھوڑا سفر باقی ہے، اس دن دلجان تھوڑی جلدی میں تھا اور وہ ملاقات میرے اور سنگت دلجان کا دوسرا اور آخری ملاقات تھا، اس کے بعد کچھ عرصے کے لیئے کہیں اور چلا گیا، تو سوشل میڈیا پر سنگت سے گفتگو ہوتا، کوئی نیوز وغیرہ ہوتا تو ہمیں بھی اس سے آگاہ کرتے اور وہ کبھی کبھار مذاق بھی کر لیتا تھا۔

اس نے مجھے فٹبال کھیلتے دیکھا تھا، تو کبھی کبھار مجھ سے فٹبال کے بارے میں باتیں کرتا، ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ سنگت آپ فٹبال کھیلتے تھے یا نہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ کبھی کبھی کھیلتا تھا، مگر فٹبال کے فاؤلوں سے ڈر کے میں زیادہ فٹبال نہیں کھیلتا تھا پھر وہ جب بھی مجھ سے رابطہ کرتا تو مجھے رونالڈو کے نام سے پکارتا۔ وہ شاید بس گفتگو کو جاری رکھنے کے لیئے ہمیں بات کرنے کا موقع دینے کے لئے مذاق کرتا رہتا۔

سنگت دلجان مجھے میرے بھائی جیسا پیارا تھا۔ وہ ایک عظیم سنگت تھا اس رشتے نے مجھے رشتوں کی حقیقی معنی سے ملایا اسکے محبت نے مجھے سنگتی کا مطلب سکھایا، آج اسی کے بارے میں کچھ لکھ رہا ہوں کہیں اس کی ایمانداری مخلصی ومحبت کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ جو ہمیشہ ہمارے نوجوانوں کو سیدھی راہ پہ لانے کے لیئے کوشاں تھا اور اخری دم تک رہا سنگت دلجان اپنا ہر کام محنت لگن اور ایمانداری کے ساتھ کرتا کبھی اپنے کام کو ادھورا نہیں چھوڑتا۔

جھالاان کے ان پہاڑوں میں آج بھی اس کی آواز گونجتی ہے، آج سب سنگت، دلجان کو یاد کرتے ہیں اور دوست دلجان اور بارگ کی جدائی سے غمزدہ تو ہیں لیکن کمزور نہیں، یہ پہاڑ یہ باغات، یہ دھرتی، سب افسردہ و حیران ہیں کہ ہم نے کس شخص کو کھو دیا ہے۔ دلجان آپ ہمیں بہت یاد آوگے، ہم ہمیشہ آپ کی کمی محسوس کرینگے، یہ آشفتہ سروں کا قافلہ یونہی چلتا رہے گا، یونہی دلجان کو کاندھے اور ملینگے، مگر وہ پہلا انسان جس نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، وہ آخر تک ساتھ رہے گا، سنگت آپ اس طرح ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی تو آپ سے سیکھنے کا موقع تھا، آپ کی شاگردی میں رہ کر کام کرنا تھا، دلجان آپ کی یادیں آپ کی وہ میٹھی باتیں، ہم کبھی بھول نہیں پائینگے اور ہم بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ کبھی ہار نہیں مانینگے، ڈٹ کر مقابلہ کرینگے، اس آخری گولی تک جو آپ نے جاتے جاتے ہمیں سکھایا ہے، دلجان نے زندگی جینے کا ہنر سیکھایا اور ضیاء بن کر موت کو گلے لگانے کا ہنر سکھا کر چلا گیا۔ دلجان ہم ثابت کرینگے کہ آپ کے بے غرض خدمات نے کتنے دلجان بنائے ہیں۔

سنگت آپ کی مشن آج بھی اپنے منزل کی جانب بڑھ رہی ہے، آپ نے رہنمائی میں ہر ایک شہید سے آگاہ کیا

تھا،آج آپ کے کربناک جدائی کے سواءاور کسی بات کا غم نہیں،غم نہیں کے اب آگے کا سفر کیسے طے ہوگا،غم اس لیئے نہیں کہ آپ نے ہمیں سکھایا ہے کہ مشکل وآسان ہر صورت میں کس طرح خود کو،اپنے تنظیم کو محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر وار کرنا ہے،آپ کے تعلیمات کئی سنگتوں کی طرح میرے لیئے بھی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہینگے۔

☆☆☆

عظیم سوچ و کردار کے مالک شہید دل جان

تحریر: بدل بلوچ

کئی بار میں کوشش کرتا آیا کہ اپنے عظیم سنگت، ہم کوپہ، غمخوار شہید دل جان کے صلاحیتوں اور فکر وسوچ پر کچھ نا کچھ تحریر کروں، مگر جب بھی قلم اٹھا کر تحریر لکھنے کا آغاز کرتا، تو قلم ہی رک جاتا تھا کہ کہاں سے شروع کروں ایسے الفاظ کہاں سے لے آؤں، جو حقیقی معنوں میں میرے سنگت کے کردار وصلاحیت اور قوم کیلئے ثابت قدمی کو بیان کرسکیں۔ مگر وہ لفظ ہی مجھے نہیں مل رہے تھے، میں لکھ ہی نا پاتا تھا، بہت کوششوں کے بعد آج ہی قلم لکھنے کو ساتھ دے رہا ہے، مگر آج بھی وہ لفظ تلاش نہ کر پایا، جو میں دل جان و بارک جان کیلئے ڈھونڈ رہا تھا۔ سنگت دل جان! شاید میرے لفظوں میں وہ کمی ضرور آئیگی، جو میں آپ کی اور آپ کے ہم کُپہ، ہم فکر، سوچ وصلاحیت کے مالک سنگت بارگ جان کے حق میں لکھ رہا ہوں تو سنگت معاف کرنا۔

سنگت دل، میں کیا کہوں اپنے آپ کو جو تیری ملاقات ہی نصیب نہ ہوا، ایک ہی شہر میں رہ کر پھر بھی آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوا۔ سنگت یا عمر کے لحاظ سے آپ سے بہت چھوٹا تھا آپ تک نہیں پہنچ سکا، کونسا بدنصیب کہوں اپنے آپ کو جو تیرے ساتھ ایک سفر ہی نہ کر پایا، بس بچپن میں آپ کے نام سنا تھا کہ ضیاء جان باغی ہے، اپنے کزن حئی کے ساتھ؛ سنگت اسی دن سے ہی آپ سے ملنا چاہتا تھا، آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا تھا کیونکہ سنگت حئی نے ہمیں محنت، پیار، محبت سے بہت کچھ سکھایا تھا۔ میں جانتا بھی تھا کہ آپ بھی ایسے سوچ کے مالک ہو، آپ کے پاس بھی ہم کو حقیقت کی رہا پر گامزن کرنے کیلئے ہزاروں الفاظ ہونگے، پر کیا کرتا سنگت قسمت کا لکھا ہوا

کچھ اور تھا، جو سنگت حئ ہم سے کم وقت ہی میں جدا ہوئے ورنہ ہر شام تیرے مجلس میں مگن ہوتے۔

سنگت وقت ہی یوں گذرتا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ صحیح اور غلط کی نشاندہی کی پہچان ہونے لگا، دن بہ دن بہتر حکمت عملی سکھاتا آیا، تب معلوم ہوا کے دشمن ہمیں خوف میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے کیونکہ دشمن یہ دن 2006 سے لیکر 2009 تک کے دن بہت قریب سے دیکھتا رہا کہ بلوچ قوم اپنے غلامی کے خلاف بچے، نوجوان، بزرگوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہیں، تو دشمن نے پھر یہ سوچا کہ اگر ہم بلوچ قوم کے ان بچوں کے دل میں موت اور گولی چلنے کی یا کسی کو لاپتہ کرنے کی خوف نہیں پھیلائینگے تو کل کے دن بلوچ قوم ہزاروں کے بجائے، پوری قوم ایک ساتھ کھڑی ہوگی۔ پھر دشمن نے کسی پر سرے عام گولی چلادی، تو کسی کو سرے عام اٹھا کر گاڑی میں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈالتے ہوئے لاپتہ کر دیا، قوم میں خوف پہلادیا۔ بچے و جوان وقت سے مجبور ہو کر چپ ہوئے، کئی جوان مسلسل چلتے رہے، تو کئی جوان چلتی راہوں میں تھک گئے، بچوں کے دل میں خوف و ہراس پھیل گیا، پھر جو کچھ تھا دل میں تھا۔

واقعی آج تیرا پیار بخوبی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ تم میں کتنی صلاحیت تھی! تم بہتر جانتے تھے کہ اس جنگ کو لڑنے کیلئے ہم سب کو ایک ہو کر لڑنا ہوگا، اب اختلافات کا وقت نہیں، ہمیں اپنے جنگ کو بہتر حکمت عملی کے ساتھ آگے لے جانا ہوگا، سب آزادی پسند سنگتوں کو ایک ہو کر لڑنا ہوگا، دشمن پر کاری ضرب لگانا ہوگا، مسلسل ان کوششوں سے آخر وہ دن بھی آیا کہ جب سب ایک ہو کر دشمن کے مورچوں میں گھس کر دشمن کو نیست نابود کرنے لگے۔

دل جان نے آخر یہ بھی ثابت کر دیا کہ ہم سب ایک ہیں، ہمارے دشمن اپنے دل سے یہ غلط فہمی نکال لیں کہ

ہمیں آپس میں اختلافات میں ڈال کر کمزور کرنے کی کوشش کریگا، ہمارا جنگ تو اب نئ شکل اختیار کرگئی ہے، دل جان اور اس کے ہم فکر، ہم سوچ، ہم گُپہ، عظیم رہنماؤں کی مسلسل کوششوں سے ہزاروں نوجوان خواب غفلت سے جاگ اٹھے۔

ایسے عظیم رہنما قوم کیلئے ہمیشہ ثابت قدم رہتے ہیں، قوم کی آنے والے دنوں کو بہتر بنانے کیلئے نئ حکمت عملی سوچتے ہیں۔ دل جان کی کوشش یہی تھی کہ ہم اپنے رابطے عوام کے ساتھ بحال کرنے کی کوشش کریں، آزادی جیسے نعمت کو حاصل کرنے کیلئے عوام کا ساتھ ہونا لازمی ہے، جس سے ہم اور آگے کی طرف بڑھ سکتے ہیں، دل جان انہی کوششوں میں دن رات مصروف رہا، دل جان اور بارگ جان نے بڑے امید کے ساتھ زہری میں قدم رکھ کر اپنے مقصد میں مصروف عمل تھے، مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ ہمیں اپنے ہی آستین کے سانپ ڈستے ہیں، اُف وہ درد، دکھ۔۔ وہ کیا لمحہ ہوگا جب دل جان بڑے ارمان دل میں لیئے بارگ جان کہہ کر پکارے گا، سنگت ہم پر اٹیک ہورہا ہے۔ جب انہوں نے کہا ہوگا کہ اب ہم آگے جا نہیں سکتے، ہماری گولیاں بھی ختم ہوگئی ہیں، بس ایک ایک گولی بچ گئی ہے، جو ہمارے جیب میں محفوظ ہے، دل جان و بارگ جان ہاتھ تھام کر آخری گولی اپنے ہی حلق میں اتار دیا ہوگا، ہزاروں رازوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے وطن کے آغوش میں امر ہوگئے۔

پہلے بارگ جان کی ثابت قدمی اور اب دل جان، اسد یوسف جان کی ایک ساتھ تصویر نکلنا نوجوانوں کیلئے مشعل راہ ہے، دونوں سنگتوں کا تعلق الگ الگ تنظیم سے تھا۔ دل جان، بی ایل اے سے اور اسد یوسف جان، بی آر اے سے مگر آپ ان کی سوچ و فکر، فلسفہ، ایمانداری، سچائی پر نظر پھیریں تو ایک ہی تھے۔ جس مقصد میں

دل جان اور بارگ جان دن رات خواری، بھوک، پیاس، سردی، گرمی برداشت کر رہے تھے۔

ایسے انسان حقیقی رہنما ہوتے ہیں، جو خود سے اور خود کی ذات سے بڑھ کر اس ماں دھرتی کا سوچتے ہیں، اس ماں دھرتی کے مسکین بچوں کا سوچتے ہیں۔ اس ماں بہنوں کے چادر کا سوچتے ہیں، جو بھائی کی راہ دیکھتے تھکتے نہیں، دل جان اسد یوسف جان بارگ جان واقعی آپ عظیم تھے اور عظیم ہیں اور آپ کی قربانی کو قوم کے نوجوان ہمیشہ سنہری لفظوں میں یاد کیا کرے گی، آج وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہیں اور کامیاب تھے، کامیاب رہینگے۔ ہر آنے والے دور میں، ہر گھر سے کئی بارگ جان اور کئی دل جان جنم لے کر دشمن پر قہر بن کر ٹوٹینگے۔

☆☆☆

چانڑدہی طوبے

نوشت: سالار بلوچ

چلہ نانن اس ئس استاک شوخی ٹی ئسر ہر کنڈ روشنائی بشخسا ئسر، مش نادامان اٹ ہر خل وبوچ تارمہ ٹی جیتاء دروشم اس ودی کننگ ئسر، پدینا چرک مُر آن چکیسہ خل وبوچ تے تواڑ ینگا زیباء ساز اس خلیسہ ئس، چُپ انگا تہاری چپی ٹی تینا گدر ینگو کا وخت نالیکوتے نازاٹ پارسائسک و لے چانڑہی طوبے تا مورئس استاک شروخ تروکا آسمان ءِ زیبائی بشخارہ و لے اینو چانڑدہ نا طوبے ءِ انت ویل اس ہلکوسس، اودنا شوخی ہر وخت ئنا اکو، اینو سوختہ سوختہ ئس و لے استارک شمبلاخ ٹی ئسر۔

ڈغار آاسٹ مَش نادامان ٹی خل اس سرجا کروک ہمیل وتو فک رہی آتخوک، تومکادوتے سینا تفیسک، مون بڑزی طوبے اُریسا کُوک کرے طوبے آ کہ خیر توارے مغرور آ طوبے اینو ہلہ بہو بہوا ُس، ہر انگ ہنانے ہر وخت نانے مغروری گلو بالی؟

طوبے دا بندغ نا توار ءِ بنگ اندن لگاتہ تیوہ غا جہان روشن مس، استار آ تا کش وبگیر ہم کم مس، طوبے آسمان نا سینہ آسلوک تینا بالا دءِ ودفسہ نازاٹ استارتا کنڈا ہریسہ پارے اسہ اندا بندغ کے مونجا ئسوٹ، اسہ اندا بندغ کے شام شام بریوہ، وختس دابندغ اے ختیر بے شون مریوہ کہوک اس حساب مریوہ، کنے ماگیر ہلیک، ای مونجا ہم مریوہ، زمین نازی آ اسے اندابندغ ءِ ہراطوبے آن بددیک و لے اسے اندا بندغ کنے کھل آن زیات

دوست ءِ۔

طوبے مونجا مریسہ اندا بندغ نا کنڈ چک ءِ ہڑسیسا پارے نی کنا سنگتی ءِ امر ہلنگ کیسہ؟ نی ہرا نگ ہناس؟ نے کنا روشنائی آن بد بریک؟ نی ہم تو بھاز روشن اُس، نی ہم ضیاء اُس، نی تینٹ روشن اُس نے استارارے او ہم روشن ء، ای تو تنیا اُٹ وا ہم کنا روشنی ءِ نی مغروری اس پاسہ۔

دا بندغ بڑز طوبے نا کنڈ ہرا نخیسہ پارے؛ نے وکنے بھاز فرخ ارے، نی غرور آن پُر اس، نی تینا بالا دئنا نازئٹی اس، نے لگیک تیوی جہان نا محتاج ءِ ولے دُن اف نی انتس اریس تینکن اُس تینا ذات ئٹی زیبا اُس نے وختان ہم پارینوٹ نے احساس اف، نی تینا روشنائی نا اُس، نے نا روشنائی ختیان کوُر کرینے۔ نی بفہ اسُل نا کنا لگپک بریسہ تو کوک کپہ کنے تو ارکپہ ای نے اونگ خواپرہ مغرور آتون کنا سنگتی اف، نی کنے آ اُردے اٹ استار مُچ کیوہ پو کیوہ کہ تینا ڈغار وآسمان نا رَکوک آک نم اورے انتیکہ استار آک فناء مننگ ءِ چارہ فناء مروکا تون کنا سنگتی ءِ کنا یاری ہموفتون ءِ ہرا بےغرض ءِ، ننے آما گیر برے نن چُپ تولپہ نن جنگ ایتنہ مُرحسینہ ما گیر ءِ، وختس زورئٹی مریک ہم نن اونا غرور ءِ پرغنہ نن تینے فناء کینہ، ٹکرتے ٹی بشخ مرینہ وا پین چندی استار جوڑ مرینہ، او دکے تہار مفنہ نن ندر مرینہ روشنائی بشخنہ، ننا رندا ٹ چندی استار آک ءِ اوفتا حوصلہ آک نا دا آسمان آن بھلن ءِ ولے طوبے نی غرور کیسہ اندا سوب نی تنیا اُس نی ہچس افیس ای نے ہچس سرپند مریوہ، کنا نا سنگتی مننگ کپک نی خوش مرنے نا زیفُو کاک پین مریرکس نے ٹی تینا زیبا سے ناخن تے، کس نے ٹی جام اس خنیک، کس تینا غم تے نے پا ہک ولے کنا خواست کنا وطن ءِ، کنا گلزمین ءِ نن اودکن روشن اُن اودکن فناء مننگ ءِ پو مرینہ، اونا مہر اونا زیبائی نے آن ہزار بشخ زیات ءِ، اونا دڑ دنا لغور آسینہ نا سگ آن بھاز مونا آٹے، نی زلفاتے آ فنا مروکا تا سنگت

مروس ولے ڈغارآ فنا مروکا تاکڑ دآن ہچ پوہ افیس، نی مفیسہ تو تہاری مریک اوتہاری ٹی ای تینا زیباغا ڈغارنا
بوچ پن خل مش تے خمیرہ تو تینا خیال تیٹی اسہ زیباؤ جہان اس جوڑ کیوہ ولے نی بریسہ تینا بے رنگ آروشنائی ءِ
ڈغارآ کنا تالان کیسہ نادا بے رنگ آروشنائی آن کنا ڈغارنا گواڑخ ہیٹُرک ہنجیر وہر پھل نارنگ بدل مریک و
رنگ ناروشنائی ٹی ماتمی خننگک تیوی بدن تا اسہ رنگ اٹ مریک تینا گواچنی دروشم ءِ بے گواہ کریفسہ فنا مروکا
استارنا دتر تے ہم نا تہاری بھور کیک ناہنداحا کمی کنے کنا ڈغارآ دوست اف کنا ڈغارجنت ناندارہ ئسے وجنت
اٹ ناہچ خواست اف ۔

طوبے مونجا مریسہ تینا کسرءِ ہلک رادہ مس دابندغ ہم کھونڈ اس پٹا ہرادے تینا ہنکین جوڑ کریس، کلّی نابائی ءِ ملہ
تینا جوڑتے پالفسہ تینا نت تے مریفے تو فک وہمیل ءِ تینا ٹہیفے منہ ساہت سائی کرے کہ مولوی عبداللہ ناہم
بانگ ئنا توارمس داسا داورنا بش مس انتیکہ گہرام ہم دامنہ وخت ءِ تینا کہُرءِ اندا جھل اٹ ہکلا کہ اونا نظرآن ہم
بچوئی ئس، داورنا مون شیف کریسہ یارمحمد نارف نارہی آ چاہ اس بیٹ کننگ کن ہڈ کرے، دروشام ئنا چاہ ئنا بوچ
آ ک ہم کُٹا سرشیف اناچُرآن ازغندنا پن ہم بنا، کمب اٹ سلوک نوکاپ نادیرآن چادان ٹی ہم اراپیالہ دیرنا
شاغسہ تینا کلّی ءِ ہم پُر کرے، یارمحمد نارف ءِ سرمس چاہ ءِ تیار کرے چادان ءِ ہرفے مچٹ بڑزی ئسے آ گا داسا
مون ئنا پٹ آشیفی روڈ ئنا پارہ غا دورگند کریسہ نظر تخسہ تینا چاہ تے کونیسہ کرے، دے ٹک تننگ تو داورنا جوڑ تیا
بشخندہ اس تالان مسک خنک تے پالن مسر دورگند اٹ تینا ڈغارآ ودی مروکا ہرزیبا ہی ءِ سیل کننگ ئسک خلک آتا
مچی ومُرآن بروکا توارآ ک دانا است اٹ لگیسا مچ نن نادمدری ءِ گم کریسہ ئسر میل تا چڑ ینگ تا توارات لمہ نا
پاروکا لیکوک بیان مننگ ئسر، سوچ ئٹی ہنادا ہموشارءِ تینا چنکی ناہنین انگادے تے گدریفیٹہ وختس شارآن
بسوٹہ تو ماما جورک ناباغ آن آڑوہلنگ کے الّمی ہناٹہ، وختس بھلا توت ئنا ماسہ ای وکنا جوانگا سنگت شریف منہ

پین سنگت توت کنگوناومویزمُچ کرینہ ماما جہانگیر آستا تلاف تو چٹ خشک ءِ داساوختس دیرآن پُرمسکہ نن غسل کرینہ بسونادے تاہم سما اُلوتینا رنگ ءِ گوآسن، حاجی حبیب ناباغ آن کوٹخو گلوءُ آن سیکل ءِ ہمپانہ، نن ءاوفک شام اٹ کو کیلی گوازی کرینہ، پیرہ اعظم خان توہُچ ءِ کوتل کریسہ دین جان استا تلاف آدرینہ، داساتو ہمودُون ہم ڈڑانے ،للکیک اندن داشارمَٹ مسونے داہندنا تومَٹ ءِ، داڑے مخلوق ناختنے ٹی دوستی اَف داڑے سنگت آک دشمن جوڑمسونو داڑے گروک ناتوارآپر بفک ،داڑے جمرآک بے سیخاء داڑے گواڑخ آتاخوءُن مریک، ضیاء انداسوچ آتیٹی ئس کہ موبائل آتے کلہواس بس، بابل ناکلہوءِ؛ سنگت نن بھلادیرآ کسر اُروک مرون بریس مونی ہنوئی ءِ۔

ضیاء چاپدان ءِ چنتہ ٹی شاغا پلاشی ناکنڈ ان شیف قبرستان ناکنڈ بریسہ اس انداڑے دعاکن سنگت نامزارآ سلیس سلام کرے سلام ناورندی ٹی بشخندہ تون اوارصمد جان پائیک تاضیاء دامڑدہ آتاشارءِ برک سنگت نن ناکسر اُروک اُن۔

ضیاء ورندی تریسہ پارے؛ سنگت نما کاریم تے ٹی بشخ اس شاغیوہ۔ چارگام خلیوہ چارورنادوہی کیوہ کنامزل ہمودے ہرانماءِ کناکسر ہمودے ہراما لوئسک کنافکرسوچ تو فک ناگڈ یکوسُم آن پدہم زندہ مروءِ۔

سنگت تے واتواراس کرے پارے؛ ہڑس جوفہ اٹ خلوک ءدابندغ آک غلامی نسل آن تفوک ءِ دافتون بس اُروک اریرک ہموتا پارت ءِ نمے ہموتا خواست ءِ نمے آن اوورناک جہدناوارث آکواوتے سرپدی تیریسہ دا پندءِ موناورسا کیرے۔ نمیوکّل ءِ سنگتا تے سلام ایتیس۔ بابل کسر اُروک ءِ ناسوئندہ نادیرآ، داپند مون مستی نما کوپہ تیاٹی ءِ۔

جوان اوارن، رخصت اَف۔

☆☆☆

شاعری: فریدہ بلوچ

دروشم ءِ ناموں اٹی نی پیشن اوس گمان تے ان

خیال و فکر سوچ انا کہ سیم ودَ نگ نشان تے ان

ہرانگ ہناس ہراڑے نی ہتم تہو تو ڈَس اف

نہ رندو کُوک نہ توار کچاری نا کہ چَس اف

نہ رنگ رنگی آبلسُم تو نہ خیسُنی تو لال انا

نہ ڈَس ارے نا شُوراتون تہو تفک ہم شال انا

گروک اتو نہ جھمر تو، تفک نا ڈَس ءِ شنزہ ہم

نے آسمان اٹ پَٹیرہ کہ استار اک قدم قدم

ارے نہ دیگری تو ڈس نہ پارہ تون ساف انا

نہ ایتیک ڈس ءِ نا کنے پری اس کوہ قاف انا

نہ پَٹ اتون پالیٔ آنہ بڑزنگ آدا چلتن تو

نا ڈس اف کس اتو نہ بولان نا کہ خُفتن تو

زہم واسپر پُھلی دلبر

تارمہ تہاری نن تا کچاری

بیدس نے آن، مو نجھاء دلجان

جھل تاروانیک، ہر ہر گدانیک

شوان تاشئر اک باسن مہر آک

پٹ آک حیران انتس گوہان

است ئنا بنداس خلینہ پنداس

زہری و بولان نیمرغ وشاشان

بیدس نے آن مو نجھاء دلجان

جمال نایاراس خنتا خماراس

درویش نافکراٹ گم وگاراس

چشمہ وچکل گواڑخ و سنبل

بج اس دسے اوفکراس تخے او

قربان ساہ ءِ تینا کرے او

گٹ و تلار آک دشت اٹ بہار آک

بیدس نے آن مو نجھاء دلجان

خلق ئنا دیگر آسمان اٹ جھمر

ہورہ گروک آک آسڑ دہ درداک

مرغن آپند آک سیم وسند آک

مولہ ناجلک ءخڑینکی خنک ء

یاداک ٹپ ءدتر نالپ ء

پنوک آ بحر آک محشر نایاداک

بیدس نے آن مو نجھاء دلجان

لمہ ناخمب ءِ، زورئتو جنگ ءِ

خلکنے ڈنگ ءِ ڈیہہ اوڑ کہ تنگ ءِ

بیوس شپادءِ بے پچ نپادءِ

سم تیتو گوازی جنگ ئنا بازی

ہمت وجوزہ نی بشخا نس

بلسم وگندار بیوس ولا چار

بیدس نے آن مو نجھاء دلجان

☆☆☆

شہید ضیاء جان عرف دلجان ٹِک ٹیر

شاعری: پھلین بلوچ

نی ننکہ ئسو سہ بولان دلجان
ننا ہر دڑ دئنا درمان دلجان

امہ نے داسہ دین اُستان دلجان
ہنین نی ئسو سہ شادان دلجان

کسر تئے نا اُروک سانگان دلجان
خڑینکی نے کنے رخشان دلجان

نخوس داکان نی اوکان دلجان
ردودھرتی چڑادلجان، دلجان

مروس بشخندہ نی قبرآن دلجان
مروآجو بلوچستان دلجان

اڑے قربان اُف ارمان دلجان
کہ مس راشد حسین زندان دلجان

امہ قربان گوری نن مفن پا
نمااے کامل آ ایمان دلجان

ہنین انگا امے ہیتا تے تو یار
ہرا اڑے کاسہ دا اُستان دلجان

شہیدی ناچِو انن نا کہ ہِنگُن
اخہ ارّف نیکہ اوغان دلجان

نے آن پَدنن ہنے نا اٹ چُتا نا
خفٹ دُن تسونن آذان دلجان

ترِ وکا حوصلہ تے آن پدنا
خُلیس ،آن یاراسوجُیّان دلجان

اے چَمّ آ تے ٹی ٹِک تیِری آ نی
کریسک دشمنے حیران دلجان

کنا بس زندئنا بچوکا داد یک
سدّ خہ نیکے گُل قربان دلجان

تر اسانی ناپھلین گواڑخ آ تا
گلاب آ فکر مس تالان دلجان

☆☆☆

شہید ماما دلجان ءِ نام ءَ

شاعری: مُلا ملنگ

گلزمین مادر ءِ اے جمال ءِ وتن
تو شہید ءِ وتن تو ھیال ءِ وتن

کندگانی تہا نندگانی تہا
سر مچاریں ضیا مئے مثال ءِ وتن

زندگاں گپ تئی لبز ءُ پر بندتئی
تو نمیرئے مدام او کمال ءِ وتن

ھچ نچارت کدی دژمن ءُ لونڑواں
بس جنان کت شتئے تو شگال ءِ وتن

وپتگئے سینگ ءَ ھانل ءِ مادر ءِ
بارگ ءِ ھمسپر گوں دمال ءِ وتن

☆☆☆

BALOCH LIBERATION VOICE
BALOCH LIBERATION ARMY
MARTYR AMEER UL MULK BALOCH | MARTYR ZIA UR REHMAN BALOCH
HAKKAL

HAKKAL
BALOCH LIBERATION ARMY

شہید حق نواز بلوچ

شہید شعیب بلوچ

شہید عرفان بلوچ

شہید جاوید بلوچ
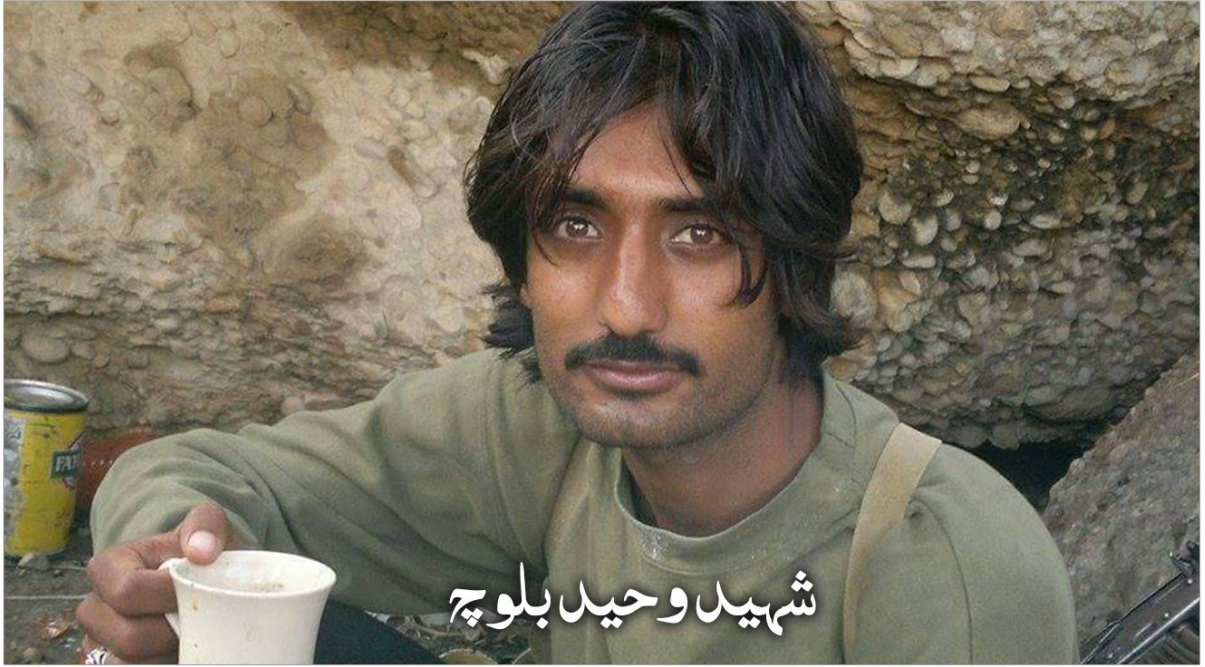
شہید وحید بلوچ

شہید مختیار بلوچ

شہید میرل نثار

BALOCH LIBERATION ARMY

شہید ضیاء الرحمن
عرف دلجان

یا حی
یا قیوم
شہیدے گلزمین
نور الحق عرف مبارگ جان
ولد
ظاہر احمد حسین زئی
03/01/1988
19/02/2018
جائے شہادت تراسانی زہری خضدار

بلوچستان ایک زرخیز زمین ہے، یہاں آپ کو ہر گھر، ہر گلی کوچے، صحراؤں، پہاڑوں اور میدانوں میں روز ایک نئی کہانی ملے گی۔ درد سے بلبلاتی کہانیاں، آہ و بکا کرتی کہانیاں، منتظر کہانیاں، بہادری، دلیری بیان کرتی کہانیاں، شجاعت کی کہانیاں، عشق کی معراج کی کہانیاں اور خود کو قربان کر کے فناء کی کہانیاں، لیکن ضرورت انہیں بیان کرنے کی ہے، ضرورت ان کہانیوں کو الفاظ کے سینوں میں اتار کر قرطاس پر بکھیرنے کی ہے، ضرورت اس ہاتھ کی ہے، جس میں یہ سکت ہو کہ ان کہانیوں کو قلمبند کر کے فرد سے فرد تک، شہر سے شہر تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرے۔

دلجان بھی ان ہی کہانیوں میں سے ایک کا مرکزی کردار ہے، جو شاید اب تک مکمل بیان نہیں ہوسکا ہے۔ کتاب "ضیاء" آپ کے سامنے ہے، اس کو مرتب کرنے کا مقصد ان بکھرے تحاریر کو مجتمع کر کے ان لوگوں تک پہنچانا، جو دلجان اور اس کے ہمسفر ساتھیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

عتیق آسکوہ بلوچ